of the unmanageable with

INHALERIN

SALBUTAMOL SULPHATE

SR 4 & 8 mg TABLETS

SUSTAINED-RELEASE FORMULATION

sthma

A serious conditi
affecting millions
people around th

Time-Tested Recommendati
for Short-acting ß$_2$ Agonists **(INHALER**

Short-acting ß$_2$ Agonists (INHALERIN) are effecti
bronchodilators.

They should be used on as required basis to reliev

They should be used before exercise in patients,
exercise induced bronchospasm.

rence: BMJ 1996; 312: 762-766 (23 March)

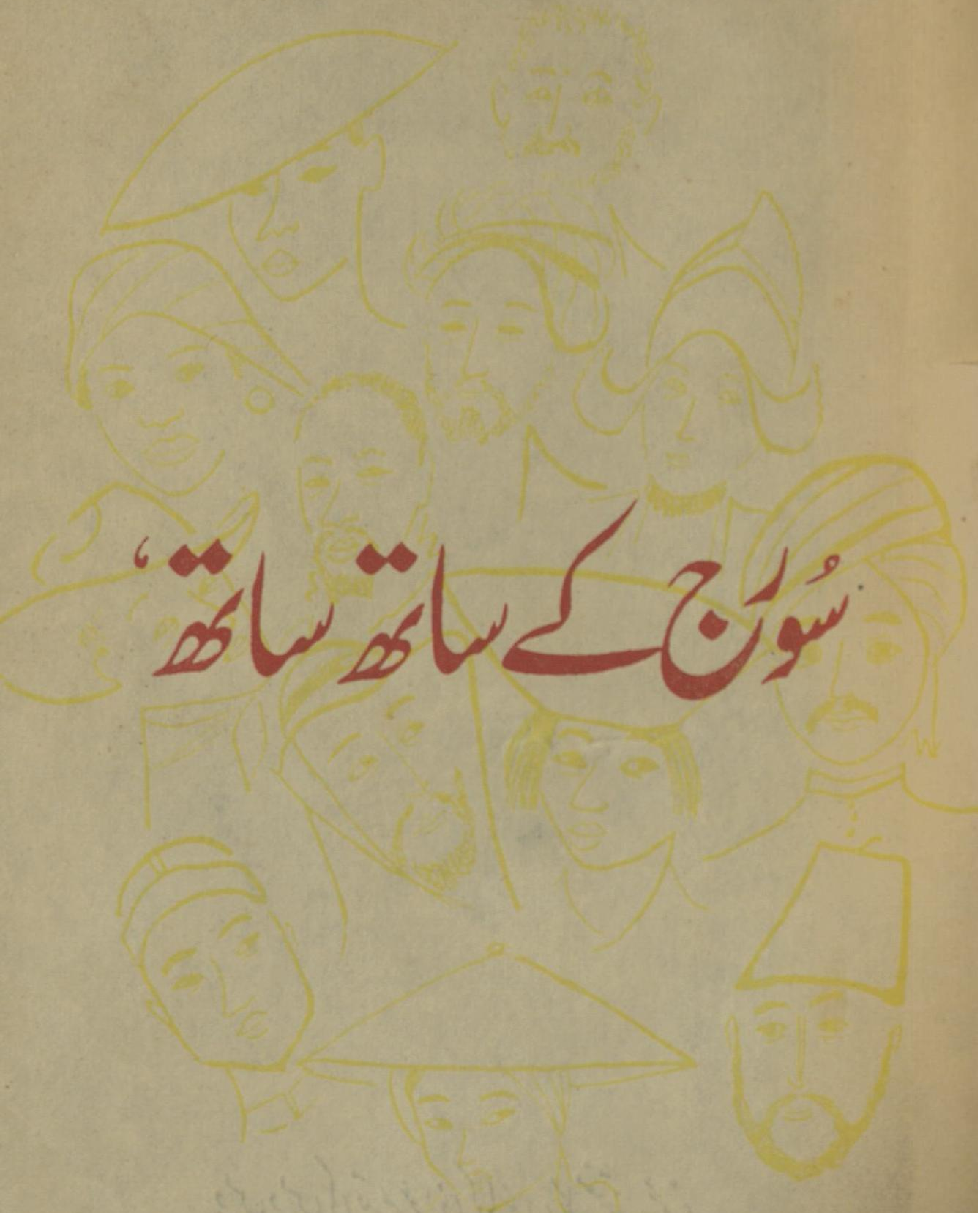
herapeutic Uses of **INHALERI**

The treatment and management of acute bronc

The management of reversible airways obstruct

The treatment of acute and chronic asthma

سورج کے ساتھ ساتھ



دیس دیس کی قدیم عوامی کہانیوں کا منتخب مجموعہ
جسے اقوامِ متحدہ کی انجمنِ خواتین کے لئے مرتب کیا گیا۔

سورج کے ساتھ ساتھ

اقوامِ متحدہ کے ملکوں کی لوک کہانیاں اور افسانے

ترتیب :- ہیرلڈ کورلینڈر

ترجمہ :- عشرت رحمانی

گوشۂ ادب • چوک انارکلی، لاہور-۲

THIRD URDU EDITION

PRINTED IN PAKISTAN

طبع سوم — ۱۹۶۹ء

تعداد — دو ہزار

ناشر — ملک مبارک علی

مطبع — اشرف پریس ، لاہور

قیمت — [illegible] پیسے

ناشر

گوشۂ ادب ، چوک انارکلی ، لاہور-۲

بہ اشتراک

موسسۂ مطبوعات فرینکلن ، لاہور — نیویارک

“ —— کتنی جلدی کاٹوں گا میں چکر ساری دنیا کا

سورج نکلے اٹھو تم بھی، اور اس کے ہمراہ چلو

دوسرے دن تک جب وہ چمکے سورج کے تم ساتھ رہو

اس کی سچائی پر تم کو تب ہی یقیں بھی آئے گا

چوبیس گھنٹے میں یہ سفر جب دنیا کا طے پائے گا”

شاہ جان اور کنٹربری کا پادری

(قدیم انگریزی گیت)

انجمن خواتین اقوامِ متحدہ

یہ کتاب اقوامِ متحدہ کی انجمنِ خواتین کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ یہ انجمن عورتوں کی ایک آزاد جماعت ہے جو اقوامِ متحدہ کے محکمۂ دارالانشا یا قومی مندوبین کے محکمہ کے ساتھ منسلک ہے۔ اس انجمن کا قیام ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ اس میں متعدد ملکوں اور براعظموں کی خواتین شریک ہیں۔ اس انجمن کا مقصد مختلف اقوام میں اتحاد اور اخوت کے رشتے کو مضبوط کرنے کے علاوہ دنیا بھر میں حسبِ ضرورت انسانی بہبود کی خاطر از خود امداد و اعانت کرنا ہے۔

اس انجمن کے اراکین نے خاص طور پر بچوں کی امداد کے لئے ہزاروں سلے ہوئے کپڑے تقسیم کئے ہیں۔ اسکول اور یتیم خانے قائم کئے ہیں اور جہاں کہیں بلائے آسمانی مثلاً سیلاب یا باد و باراں کے طوفان کا نزول ہوا ہے، وہاں کھانا، کپڑا اور مالی امداد بھی بہم پہنچائی ہے۔

اس انجمن کی ارکان خواتین نے یونی سیف اور یونسکو کی طرف سے بہت سے علاقوں میں لوگوں کی مصیبتیں دور کرنے کی غرض سے خاص فنڈ جمع کرنے میں جد و جہد کی ہے۔

اصل انگریزی کتاب کی کل آمدنی اسی قسم کے امدادی کاموں میں صرف کی جائے گی۔

اظہارِ تشکر

اقوامِ متحدہ کی انجمنِ خواتین اس امداد و اعانت کی شکر گزار ہے جو اقوامِ متحدہ کے مندوبین کی جانب سے اس کتاب کی کہانیوں کے انتخاب اور تدوین کے سلسلہ میں حاصل ہوئی۔ نیز محکمہ اطلاعاتِ عامہ کے تعاون کی رہینِ منت ہے۔ ان تمام حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ جنہوں نے اس کتاب کی تدوین کے سلسلہ میں ٹائپ کے کام میں، ترجمہ میں یا دوسرے تحریری کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ البتہ ادارۂ تدوین انجمن ہذا کے اراکین کا، محکمہ دارالانتشار کا اور اقوامِ متحدہ کے اراکین کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں کسی نہ کسی حیثیت سے اعانت کی۔

ان تمام مصنفین و ناشرین کے ہم خاص طور پر شکر گزار ہیں۔ جنہوں نے ازراہِ کرم اپنی مطبوعہ کہانیوں کی اشاعت کی بلامعاوضہ اجازت عطا کی اور جن کے ضروری جوابوں کی تفصیل ہر کہانی کے ضمن یا نوٹ میں شامل ہے۔

ان تمام متعدد اصحاب اور اداروں کے علاوہ جنہوں نے اس کتاب کا مواد فراہم کرنے میں خصوصی امداد بہم پہنچائی، حسبِ ذیل ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔

وزارتِ تعلیم، بگوٹا۔ کولمبیا اور ٹرانسوال کے محکمہ تعلیمات۔ پریٹوریا۔ جنوبی افریقہ

(جنہوں نے اپنے اپنے ملک کی کہانیاں فراہم کیں۔)

مسز ایلین ایم ہوپکنس (ایلین مور) (آر۔ این) ڈائرکٹر سیموئیل گرانٹ۔ میٹرنل اینڈ چائلڈ ویلفیئر سنٹر کگاٹا۔ لائی بیریا (لائی بیریا کی کہانی کے لئے) سینورا ا میریا کنسپشن، یزڈی کیوز صدر انٹر امریکن کمیشن فار ویمن، پان امریکن یونین۔ واشنگٹن (پیراگوئے کی قدیم کہانی کے لئے)

مسٹر الرک ویلیمز ویلنگٹن۔ نیوزی لینڈ (ماؤری کی کہانی کا مواد فراہم کرنے کے سلسلہ میں ان کی اعانت سے کہانی "ماؤئی، جس نے آگ ایجاد کی" حاصل کی گئی)

ڈاکٹر اے، پی، ایلکن، سڈنی یونیورسٹی (آسٹریلیا) (ان کی تجویز اور ہدایت کی بناء پر آسٹریلیا کی کہانیوں کے لئے قدیم اصلی مواد حاصل کیا گیا۔)

ڈاکٹر ہیری شاپک۔ امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری۔ نیو یارک (ان کی تجاویز و امداد سے بولیویا کی کہانی "آسین کے کارنامے" حاصل کی گئی)

ڈاکٹر جیمز، اے نوٹوپلس۔ ٹرینی کالج۔ ہارٹ فورڈ کنکٹیکٹ (ان کی امداد سے یونانی کہانی "شکاری کا بیٹا" حاصل کی گئی)

یہ کتاب معنون ہے
دنیا بھر کے حاجت مند بچوں کے نام

بچوں کا منشور

دنیا میں امن ہو گا نہ اس وقت تک کبھی
جب تک کہ بچہ بچہ کو روٹی نہ مل سکی
پہنے وہ گرم کپڑے کہ سردی سے بچ سکے
پھر دل لگا کے اپنا سبق شوق سے پڑھے

کچھ بھوک کی ہو فکر، نہ حاجت، نہ ڈر ذرا سے
رنگ اور ذات پات کے جھگڑوں سے وہ بچے
ہنستے ہوئے اٹھائے وہ سر سوئے آسماں
انسانیت کا آنکھوں میں ہو نور بے گماں

دیباچہ

(از مترجم)

کہانیاں سننے کا شوق انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جہالت کے دور میں جب سے انسان نے بول چال شروع کی، کہانی کہنے اور سننے کا مشغلہ بھی شروع ہوا، لکھنے پڑھنے کی ابتدا ہوئی تو کہانیاں جو زبانی سنائی جاتی تھیں، لکھی جانے لگیں، اور کتاب خانوں کا دور شروع ہوتے ہی قدیم قصے کہانیاں دنیا بھر کے کتاب خانوں کی زینت بننے اور محفوظ ہونے لگیں۔

چھاپے کی ایجاد نے اس دلچسپ اور محبوب ترین مشغلے کو مقبول عام بنا دیا، اور ملکوں ملکوں کی مختلف زبانوں کی کہانیاں، قصے اور عوامی داستانیں، دیس دیس، شہر شہر اور قریہ قریہ پہنچ کر بلا امتیاز رنگ و نسل، عوام و خواص، بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد سب کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ بننے لگیں، اس طرح ان کہانیوں کی بدولت دنیا بھر میں ایک انسانی برادری کا قیام عمل میں آیا اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ دنیا کے تمام انسان پیدائشی طور پر اپنی عادات و اطوار میں بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ البتہ آب و ہوا اور قومی انفرادیت کے لحاظ سے نیز اپنے اپنے تہذیب و تمدن کے مطابق ان میں کچھ نہ کچھ امتیازی خصوصیت پیدا ہوتی رہتی ہے، ورنہ جہاں تک انسانیت اور انسانی خصائص نیکی بدی، اچھے بُرے عادات و اخلاق کا تعلق ہے کہیں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

یہ مجموعہ "سورج کے ساتھ ساتھ" اسی قسم کی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ جسے اقوام متحدہ کی انجمنِ خواتین نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، حقیقت میں اس کتاب کی اشاعت ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس انجمن نے دنیا بھر کے تمام مہذب ممالک کے کتاب خانوں سے چھان بین کر کے مختلف زبانوں سے ایسی عام فہم اور پسندیدہ

کہانیاں جمع کی ہیں جو خاص طور پر بچوں کے لئے لکھی گئیں، ان میں بہت سی کہانیاں نادر مجموعوں اور نایاب نسخوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ جن کی تفصیل اصل کتاب کے آخر میں درج کی گئی ہے۔ لیکن قارئین کی سہولت کے لئے ترجمہ میں نوٹ ہر کہانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے، اس سے ہر کہانی کی خصوصیت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے، بچے ہر ملک اور ہر قوم کی تہذیب و ترقی کا سرمایہ ہیں، ان کی تربیت قوم کی تربیت ہے اور کہانیاں نئی پود کی تفریحی تعلیم و تربیت کا بہترین اور آسان ذریعہ ہیں۔

اس کا ایک مفید مقصد اس انجمن کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ اصل کتاب کی آمدنی دنیا بھر کے حاجتمند بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے صرف کی جائیگی اسی لئے یہ کتاب ساری دنیا کے بچوں کے نام معنون کی گئی ہے۔

پاکستانی نونہالوں کی خدمت میں یہ ترجمہ پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی ہے کہ اس مجموعے کی وساطت سے ہم اپنی قوم کی نئی پود کو ساری دنیا کی کہانیوں سے روشناس کر کے ملکوں ملکوں کی سیر کرا رہے ہیں، توقع ہے کہ ہمارے بچے اس کتاب سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کے نصب العین کو سمجھ کر اپنے ننھے دماغوں میں انسانی اخوت کا سچا شعور پیدا کریں گے، اپنی ذات کو ان عادات اور اخلاقی صفات سے آراستہ کریں گے، جن میں نیکی، سچائی اور انسانی بہبود جھلکتی ہے اور دنیا میں امن اور صلح کے حامی بن کر اپنے ملک اور قوم کا بول بالا کریں گے۔

عشرت رحمانی

لاہور۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء (عالمی امن کا یادگار دن)

کہانیوں کی فہرست

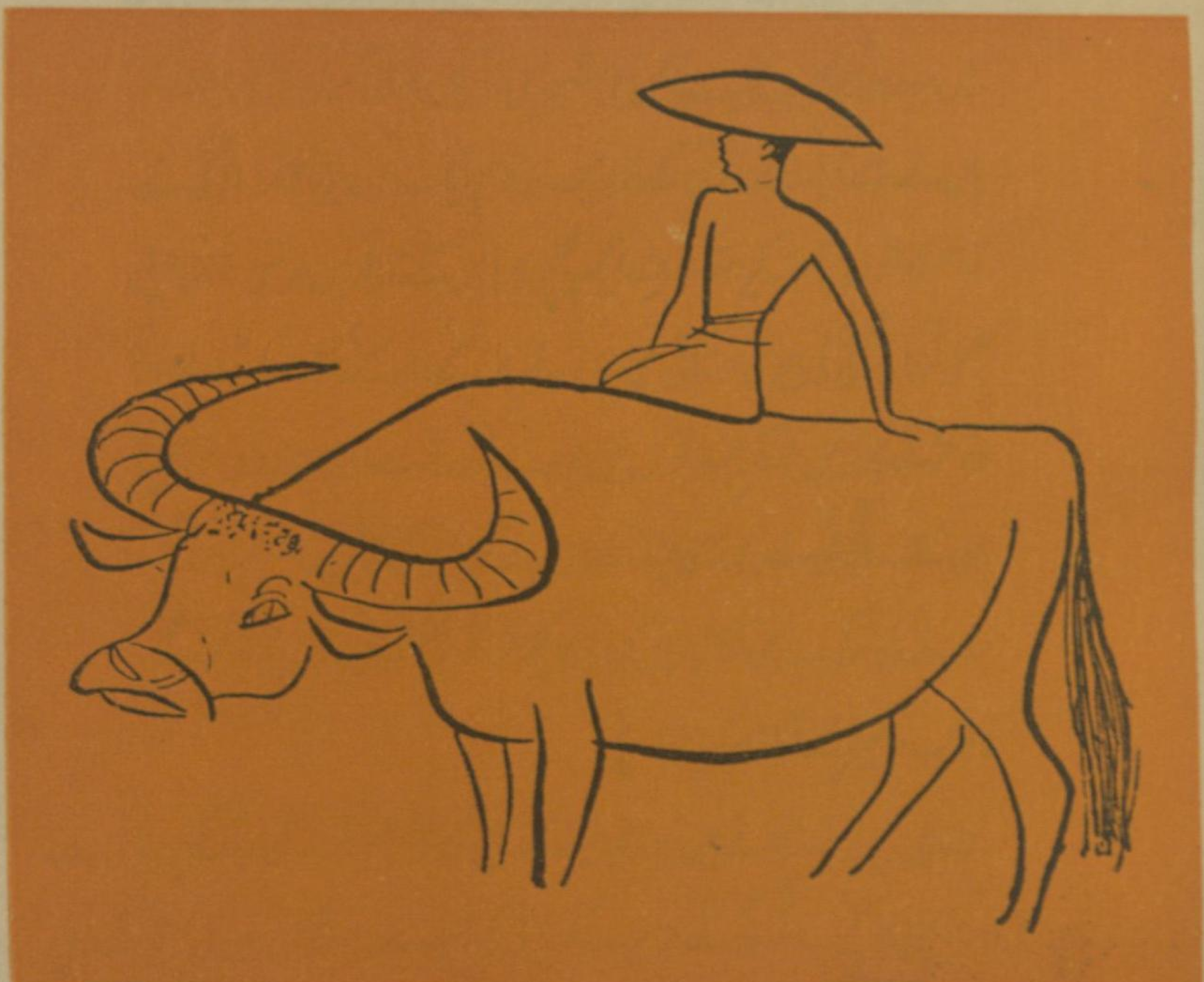
(ج) ایشیائی و افریقی مشرقِ وسطیٰ کی کہانیاں

(د) افریقہ کی کہانیاں

(س) یورپ کی کہانیاں

(ف) امریکا کی کہانیاں

مشرقِ بعید



۱

ماؤئی جس نے آگ ایجاد کی

[قدیم ماؤئی کی کہانی کی بنیاد پرانے قصے کہانیوں پر ہے ماؤئی کو اس زمانہ کا بڑا دیوتا مانا گیا ہے۔ یہ کہانی پولینیشیا کی اس تہذیب کی یاد دلاتی ہے جو نیوزی لینڈ سے جزیرہ ہوائی تک پھیلی ہوئی تھی، اس طرح کے قصے کہانیاں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جزیرے جزیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ ماؤئی کے بارے میں بہت سی عجیب عجیب باتیں بھی مشہور چلی آتی ہیں مثلاً آسمان کی نیلی چھت کو اس نے بلند کیا ہے گو ماؤئی کے نزدیک یہ کام ایک اور دیوتا کا تھا ماؤئی نے تمام ہواؤں پر قبضہ کیا تھا صرف ایک پچھمی ہوا اس کے قابو میں نہ تھی۔ جناتی ایل مچھلی ٹونا ماؤئی کی بیوی کو ستاتی تھی، اس نے اس کے مار کے ٹکڑے کر ڈالے اور وہ ٹکڑے ہوا میں بکھر کر میدانوں میں پودے، درخت اور سمندروں میں مچھلیاں بن گئے۔ ماؤئی نے نیوزی لینڈ کے جزیرے کو پانی کی سطح پر قائم کیا اور آگ جلانے کی ترکیب بھی نکالی، اس کہانی کا کچھ مواد ولنگٹن (نیوزی لینڈ) کے الرک ولیمز نے فراہم کیا تھا۔]

کہتے ہیں پرانے زمانے میں نیوزی لینڈ کی زمین کی سطح ہموار نہ تھی، بلکہ کہیں پانی سے نیچے تھی اور کہیں اونچی۔ ماؤئی نے جزیرے کو پانی کی تہہ سے اٹھا کر زمین کی سطح کے اوپر

قائم گیا۔ جہاں وہ آج بھی موجود ہے۔ ماؤئی نے مچھلی کے شکار کے لئے کانٹا تیار کیا، پتنگ ایجاد کی، انسان کو آگ جلانے کی ترکیب بتائی اور دن کو اتنا بڑھایا کہ انسان آرام سے کام کاج کر سکے۔

جب ماؤئی پیدا ہوا تو وہ بہت ہی چھوٹا اور خوفناک شکل کا تھا، اس کی ماں نے اسے سمندر کے قریب ایک جنگل میں چھوڑ دیا۔ پانی کے دیوتا نے اس کی حفاظت کی اور آسمان کے دیوتا نے اسے عقل سکھائی۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو ماں باپ کی تلاش میں ایک میدان میں نکل آیا۔ یہاں اس کے بھائی کھیل رہے تھے۔ وہ اس کی خوفناک شکل دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ماؤئی نے کہا "میں تمہارا چھوٹا بھائی ہوں" مگر وہ نہ مانے۔ اتنے میں اس کی ماں بھی آ گئی، وہ دیکھ کر بولی "تم تو میرے بچے نہیں ہو" ماؤئی نے کہا کیا تم نے مجھے سمندر کے کنارے جنگل میں نہیں چھوڑا تھا؟" یہ سن کر ماں اسے پہچان گئی اور کہا "ہاں تم بھی میرے بچے ہو" اور اس کو ساتھ گھر لے گئی۔

اب ماؤئی اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنے بسنے لگا، ایک دن اس کے بھائی کشتی میں مچھلی کے شکار کو گئے۔ مگر ماؤئی کو ساتھ نہیں لے گئے، جب وہ شکار کھیلنے لگے تو کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی، کیونکہ ان کے پاس صرف مچھلی پکڑنے کی چھڑی تھی۔ مگر کانٹا نہیں تھا۔ آخر ہار کر وہ گھر واپس آ گئے، جب ماؤئی کو معلوم ہوا تو اس نے مچھلی پکڑنے کا کانٹا اور ایک جال بھائیوں کو بنا کر دیا۔

ایک دن انہوں نے پھر شکار کھیلنے کا ارادہ کیا۔ ماؤئی چپکے سے کشتی کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا، اس کے بھائی کشتی میں سوار ہو کر شکار کو روانہ ہو گئے۔ جب وہ دور نکل گئے تو بولے "خدا کا شکر ہے کہ ماؤئی ہمارے ساتھ نہیں" ماؤئی نے کونے میں سے آواز دی "بھائیو! میں یہاں موجود ہوں" یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا کشتی کے کونے سے باہر

نکل آیا۔ اس کے بھائیوں کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اور انہوں نے اسے مچھلی کا کانٹا نہیں دیا۔ مگر ماؤئی کے پاس جادو کا کانٹا تھا جو اس نے پانی میں پھینکا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کشتی ڈولنے لگی، وہ خوف زدہ ہو گئے، اور سب نے مل کر ڈوری کو کھینچنا شروع کیا۔ بہت دیر کی کوشش کے بعد ایک اژدہا مچھلی ان کے کانٹے کے ساتھ باہر نکلی۔

جب وہ مچھلی سطح پر آئی تو اتنی بڑی تھی کہ دور دور تک اس کے پھیلاؤ کی وجہ سے پانی نظر نہیں آتا تھا، کہتے ہیں کہ اسی مچھلی کی پیٹھ پر نیوزی لینڈ کا جزیرہ آباد ہے۔ اب ماؤئی اور اس کے بھائی مچھلی کی پیٹھ پر چڑھ گئے اور چھروں سے اس کو کاٹنا شروع کر دیا۔ کہیں تو اس کے خون سے دریا بن گئے اور کہیں اس کی ہڈیوں پر پہاڑ کھڑے ہو گئے، اس طرح سمندر کی تہ سے نیوزی لینڈ کا جزیرہ سطح پر ابھر آیا۔

پھر ماؤئی نے محسوس کیا کہ سورج بہت جلد چھپ جاتا ہے اور دن اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ لوگ نہ تو اپنے کپڑے سورج کی روشنی میں خشک کر سکتے ہیں، اور نہ اچھی طرح کام کاج کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس نے سوچا کہ کسی طرح سورج کو قابو میں کرنا چاہیے تاکہ وہ زمین کے گرد آہستہ چلے اور دن کی روشنی زیادہ دیر تک رہے۔

چنانچہ اس نے بھائیوں سے کہا کہ "آؤ سورج کو رسوں سے باندھ دیں" مگر وہ بولے "یہ ناممکن ہے، کیونکہ سورج کی گرمی ہر چیز کو جلا دیتی ہے" ماؤئی نے جواب دیا "میرے لئے ہر کام ممکن ہے۔ میں سورج کو قید کر سکتا ہوں۔"

اب ماؤئی نے اپنی بہن کے سر کے بال لئے انہیں پٹ سن میں ملا کر جادو کے زور سے ایک بہت بڑا رسہ تیار کیا اور اس رسے سے ایک جال تیار کیا،

پھر اپنے بھائیوں کو لے کر کئی مہینے کے سفر کے بعد وہ دنیا کے اس حصے میں پہنچا جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ انہوں نے رات کے اندھیرے میں جال وہاں پھیلا دیا جب سورج طلوع ہوا تو وہ جال میں پھنس گیا۔ اس نے جال سے نکلنے کی بہت کوشش کی اور رسوں کو توڑنا چاہا۔ مگر ماؤئی نے جادو کی چھڑی سے سورج کو خوب مارا پیٹا۔ سورج غصے میں آگ اگلنے لگا۔ ماؤئی کے بھائی یہ گرمی برداشت نہ کر سکے، اور وہاں سے بھاگ گئے۔ مگر ماؤئی وہیں ڈٹا رہا اور سورج کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر سورج چیخ پڑا کہ "مجھے کیوں سزا دے رہے ہو؟" ماؤئی نے جواب دیا۔ "تم بہت تیزی سے زمین کا چکر لگاتے ہو۔ اس لئے دن اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ لوگ اپنا کام کاج ختم نہیں کر سکتے" سورج نے کہا "میرے پاس اس سے زیادہ وقت نہیں" اس پر ماؤئی اور سورج میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر سورج سخت زخمی ہوا اور بولا "مجھے معاف کر دو، اب میں زمین کے گرد آہستہ چلوں گا۔" ماؤئی نے سورج کو معافی دے دی اور آزاد کر دیا، اس دن سے سورج آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ دن بڑے ہو جانے سے لوگ آرام سے اپنا کام کاج کرتے ہیں اور اپنے کپڑے سورج کی روشنی میں اچھی طرح سکھاتے ہیں۔

کچھ دن کے بعد ماؤئی کو خیال آیا کہ لوگوں کو آگ جلانے کا طریقہ معلوم نہیں ماؤئی نے سوچا کہ یہ راز زمین کی تہہ سے معلوم کیا جائے، چنانچہ وہ ایک سوراخ کے ذریعے زمین کی تہہ میں چلا گیا۔ وہاں آگ کی دیوی "مافوئی کے" رہتی تھی۔ ماؤئی نے دیوی سے آگ کی چنگاری مانگی۔ دیوی نے اپنی ایک انگلی کا جلتا ہوا ناخن اسے دے دیا۔ وہ ناخن لے کر چل دیا، راستے میں اسے خیال آیا کہ آگ تو مل گئی مگر جلانے کا طریقہ معلوم نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر اس نے ناخن کو ندی میں پھینک دیا اور دیوی کے پاس دوبارہ چنگاری لینے کے لئے گیا۔ دیوی نے ماؤئی کو دوسرا انگلی کا جلتا ہوا ناخن دیا۔

ماؤئی نے اسے باہر لاکر پھر ندی میں پھینک دیا۔ اسی طرح ماؤئی دسویں بار آگ کی دیوی کے پاس گیا اور آگ مانگی۔ اس پر دیوی کو بہت غصہ آیا اور ماؤئی کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑی، جب وہ بھاگ رہی تھی تو دیوی نے غصے میں اپنی دسویں انگلی کا ناخن بھی پیچھے سے ماؤئی پر پھینکا۔ ماؤئی تو بچ گیا۔ مگر اس ناخن سے جنگل میں آگ لگ گئی۔ ماؤئی بہت پریشان ہوا۔ اس نے بارش سے مدد مانگی۔ تھوڑی دیر میں زور کی بارش شروع ہو گئی۔ جس سے جنگل کی آگ بجھ گئی۔ دیوی نے جب آگ کو بجھتے ہوئے دیکھا تو جلدی جلدی تھوڑی سی آگ جمع کی اور درختوں کی جڑوں میں چھپا دی، اس دن سے یہ آگ زمین میں اب تک دفن ہے۔ مگر انسان کو آگ کا یہ بھید معلوم ہو گیا کہ لکڑیوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے، اور جب ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آگ جلا لیتا ہے۔

۲

اژدہے کے زہر کی تھیلی

[اس کہانی کا ماخذ "اِگوانا اور کالا ناگ" ہے جو آسٹریلیا کی پرانی داستانوں سے لی گئی ہے۔ یہ آسٹریلیا کی ایک قدیم عوامی کہانی ہے، کالے ناگ نے اپنی چالاکی سے (اِگوانا) اژدہے کے زہر کی تھیلی حاصل کر لی۔ مگر اژدہا ہی ایک ایسا جانور ہے جس پر کالے ناگ کے کاٹے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آسٹریلیا کی یہ پرانی داستانیں "کے لینگلو پارکر" نے مرتب کی تھیں جنہیں "اینگس اینڈ رابرٹسن لمیٹڈ (سڈنی)" نے ۱۹۵۳ء میں منتخب کر کے شائع کیا]

پرانے زمانے میں عجیب عجیب طرح کے جانور پائے جاتے تھے جو آج کل نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں کالے ناگ میں زہر نہیں تھا مگر اژدہا بہت زہریلا جانور تھا۔ انسان حیوان سب اس کے خوف سے کانپتے تھے، ایک دن سب جانوروں نے مل کر جلسہ کیا جس میں یہ سوچا گیا کہ "کیا تدبیر کی جائے جس سے ہمیں اس اژدہے سے نجات ملے" ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کالا ناگ بھی ادھر آنکلا، اس نے جلسے کی وجہ معلوم کی تو ایک جانور نے جواب دیا کہ "ہم اژدہے کو ختم کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنے زہر سے سب کو پریشان کر رکھا ہے، کنگرو بولا "اگر ہم اس کا مقابلہ کریں گے تو وہ ہمیں ڈس لے گا ——— کالے ناگ نے کہا کہ اچھا میں سب کو اژدہے سے نجات

دلواؤں گا اور ایسی تدبیر کر دوں گا کہ کل شام سے پہلے اژدہے کے زہر کی تھیلی میرے قبضے میں ہوگی۔" سب جانوروں نے کہا کہ "اژدہے سے جو لڑے گا وہ ختم ہو جائے گا۔" کالا ناگ بولا۔ "میں اس سے لڑوں گا نہیں۔ بلکہ اس کے زہر کی تھیلی اٹھا لاؤں گا۔" اس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

کالا ناگ وہاں سے چل دیا۔ اژدہے کے گھر کے قریب پہنچا اور رات وہیں بسر کی، جب صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اژدہے نے تین آدمیوں کو کاٹا اور انہیں کھا کر گھر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گیا، اس وقت کالے ناگ نے سوچا کہ اژدہے کو ختم کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ لیکن اسے فوراً خیال آیا کہ اسے مارنے سے بہتر ہو گا کہ اس کے زہر کی تھیلی حاصل کی جائے۔

کچھ دیر کے بعد اژدہے کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے سامنے کالے ناگ کو دیکھا اور فوراً اس کو کاٹنے کے لئے دوڑا۔ اس پر کالا ناگ چلایا "ٹھہرو، مجھے مت مارو میں تمہارے لئے بہت ضروری خبر لایا ہوں۔ تمہیں ختم کرنے کے لئے ایک سازش کی گئی ہے" اژدہا بولا "میں کسی سازش سے نہیں ڈرتا۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسان اور حیوان مجھ سے خوف کھاتے ہیں۔" کالا ناگ بولا "سب جانوروں نے مل کر ایک خوفناک سازش کی ہے" اژدہا بولا "اچھا بتاؤ وہ کیا سازش ہے" کالے ناگ نے کہا میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مگر تم نے مجھ پر حملہ کیا، ایسی صورت میں میں تمہاری جان کیسے بچاؤں" اژدہے نے جواب دیا "کہ اگر تم مجھے سازش سے آگاہ کر دو گے۔ تو تمہاری جان بخشی ہو جائے گی"۔ کالے ناگ نے کہا "میں تمہیں اس شرط پر بتاؤں گا کہ پہلے اپنے زہر کی تھیلی مجھے دے دو" اژدہا بولا "یہ نہیں ہو سکتا کچھ اور مانگو"۔ کالے ناگ نے کہا "اگر تمہیں یہ شرط منظور نہیں تو خدا حافظ" اژدہے نے

کہا۔ "ٹھہرو" یہ کہہ کر اس نے اپنے منہ سے زہر کی تھیلی نکال کر باہر رکھ دی اور کالے ناگ سے کہا کہ "اسے چھونا نہیں، ورنہ تم مر جاؤ گے" کالے ناگ نے کہا "یہ تھیلی میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ ورنہ میں نہیں بتاؤں گا" اژدہے نے تنگ آکر وہ تھیلی کالے ناگ کے ہاتھ پر رکھ دی اور بولا "اب تو سازش کا حال بتاؤ" کالے ناگ نے فوراً زہر کی تھیلی اپنے منہ میں ڈال لی، اور بولا "یہی تھی وہ سازش۔ میں نے جانوروں کے جلسے میں یہ طے کیا تھا کہ تمہاری زہر کی تھیلی چھین لی جائے۔ اچھا شکریہ! اب میں اجازت چاہتا ہوں"

کالا ناگ یہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اژدہے نے اس کا پیچھا کیا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھرا ہوا تھا کہ وہ کالے ناگ کو پکڑ نہیں سکا۔

کالا ناگ ہانپتا کانپتا جانوروں کے پاس پہنچا اور ان کو زہر کی تھیلی حاصل کرنے کا سارا حال سنایا۔ سب نے کالے ناگ کی بہادری کی بہت تعریف کی اور کہا کہ "لاؤ اس زہر کو ضائع کر دیں" مگر ناگ نے زہر کی تھیلی دینے سے انکار کر دیا۔ سب جانوروں نے کہا "اگر تم ہماری بات نہیں مانتے تو یہاں سے چلے جاؤ" کالے ناگ نے کہا۔ "میں یہیں رہوں گا" سب جانور بولے کہ "ہم تمہیں مار ڈالیں گے" کالا ناگ نے کہا "شاید تم بھول گئے ہو کہ اب اژدہے کے زہر کی تھیلی میرے قبضے میں ہے، اگر کسی نے میرا مقابلہ کیا تو میں اسے ختم کر دوں گا"

کہتے ہیں کہ اسی دن سے کالے ناگ کا کاٹا کبھی نہیں بچتا، اور ساری مخلوق اس سے ڈرتی ہے۔ مگر اژدہے کو اب بھی امید ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن کالے ناگ سے اپنے زہر کی تھیلی ضرور واپس لے گا، جب بھی وہ کالے ناگ کو دیکھتا ہے، دونوں میں جھڑپ ہو جاتی ہے، مگر اژدہے پر کالے ناگ کے کاٹے کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ

وہ فوراً ایک خاص قسم کی بوٹی کھالیتا ہے جس سے زہر بے اثر ہو جاتا ہے اس زہر کا علاج صرف اژدہے کو معلوم ہے اور اس نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا۔

۳

بندر اور کچھوے نے درخت بانٹا

[اس کہانی کا ماخذ "ٹینگلوگ ٹیکسٹس" ہے۔ جسے "لیونارڈ بلوم فیلڈ" نے مرتب کیا اور "الینوائس پریس یونیورسٹی اربانہ" نے ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ یہ کہانی فلپائن کی مقبول عوامی کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے جو ہسپانوی زبان سے لی گئی ہیں لیکن جنوبی امریکہ کی طرح ان قدیم کہانیوں کے احیاء کی یہاں بھی عظیم مہم درپیش ہے، اس کہانی کی اصل یورپ سے مختلف ہے لیکن اس کا مرکزی خیال اس کہانی سے ملتا جلتا ہے، جس میں ایک کچھوے کی حاضر دماغی کا ذکر ہے کہ اس نے کس طرح اس بہانہ سے جان بچائی تھی کہ "مجھے جو چاہو سزا دو۔ مگر پانی میں نہ پھینکنا"۔

اس قسم کی ایک کہانی نئی دنیا کے اس خرگوش کی ہے۔ جس نے اپنے کو جھاڑی میں گرنے سے بچایا تھا۔ اور ایتھوپیا کے اس باز سے ملتی جلتی ہے جو پہاڑ کے نیچے پھینکے جانے سے بچ کر نکل گیا تھا۔]

ایک دن ایک کچھوا ندی کے کنارے دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دور سے ایک کیلے کا درخت ندی میں بہتا چلا آرہا ہے۔ کچھوے نے ندی میں چھلانگ

لگائی اور درخت کو کھینچ کر کنارے پہ لے آیا۔ مگر وہ درخت کو باغ تک نہیں لے جا سکا۔ جہاں وہ اسے لگانا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ایک بندر کو بلایا اور اس سے کہا۔ ذرا میرے ساتھ یہ کیلے کا درخت باغ تک لے چلو۔ وہاں میں اسے لگانا چاہتا ہوں۔" بندر بولا۔ "اس کام کے بدلے مجھے بھی درخت کا حصہ دو گے؟" کچھوے نے کہا "ضرور دوں گا" اور وہ دونوں درخت کو گھسیٹ کر باغ میں لے گئے، پھر کچھوا بولا "آؤ گڑھا کھود کر اسے زمین میں لگا دیں" بندر نے کہا۔ "پہلے میرا حصہ مجھے دے دو" کچھوے نے کہا۔ جب یہ درخت لگ جائے گا اور اس میں پھل آئے گا تو ہم آدھا آدھا کر لیں گے"۔ مگر بندر نہ مانا اور بولا "میں تو ابھی آدھا درخت لوں گا"۔

کچھوے نے مجبور ہو کر کیلے کے درخت کو کاٹ کر دو حصے کر دیئے۔ بندر نے ہرے بھرے پتے دیکھ کر کچھوے سے کہا کہ "اوپر کا حصہ میں لوں گا" کچھوے نے یہ بھی منظور کر لیا۔ چنانچہ بندر اپنا حصہ گھر لے گیا اور اسے زمین میں لگا دیا، ادھر کچھوے نے بھی اپنا درخت لگا دیا، کچھ عرصہ بعد اس کے درخت میں ہرے ہرے پتے نکل آئے اور بہت سے کیلے بھی لگ گئے مگر بندر والا درخت سوکھ کر گر گیا۔

جب کچھوے کے کیلے تیار ہو گئے تو اس نے انہیں توڑنا چاہا۔ مگر وہ مجبور تھا کیونکہ وہ درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ آخر ہار کر اس نے پھر بندر کو بلایا اور اس سے کہا "اگر تم میرے کیلے درخت سے اتار دو تو آدھے تمہارے اور آدھے میرے"۔

بندر نے یہ شرط منظور کر لی اور جھٹ درخت پر چڑھ گیا، اوپر جا کر اس نے کیلے کھانے شروع کر دیے اور کچھوے کو ایک بھی نہ دیا۔ کچھوا بولا "تم خود ہی کیلے کھا رہے ہو نیچے بھی تو پھینکو" مگر بندر نے صاف انکار کر دیا اور مزے مزے میں کیلے تو خود کھاتا رہا اور چھلکے نیچے پھینکتا گیا۔ اس پر کچھوے کو سخت غصہ آیا۔ آخر اسے ایک

ترکیب سوجھی۔ وہ دوڑ کر کھیت میں گیا اور بہت سی کانٹے دار جھاڑیاں درخت کے گرد لا کر بچھا دیں، جب بندر نے سب کیلے کھا لیے اور زمین پر چھلانگ لگائی تو سارے کانٹے اس کے پاؤں میں گھس گئے اور وہ تکلیف سے چیختا چلاتا ادھر ادھر اچھلنے لگا۔ بندر بری طرح زخمی ہؤا، کچھوا بھی قریب کھڑا یہ تمام تماشا دیکھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ بندر کوشش کر کے کچھوے کی طرف لپکا اور غصے میں اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا اور بولا "اب بتاؤ میں تمہیں کیا سزا دوں؟ تمہیں پیٹوں یا دریا میں پھینک دوں" کچھوے نے بڑی عاجزی سے کہا "مجھے جو چاہو سزا دو مگر خدا کے واسطے پانی میں نہ پھینکنا۔"

بندر نے اچھل کر کہا کہ "میں تو تمہیں دریا میں ہی پھینکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ کچھوے کو اٹھا کے دریا کے کنارے لے گیا اور اسے گہرے پانی میں پھینک دیا۔ کچھوا پانی میں گرا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب بندر بہت خوش تھا کہ کچھوا ڈوب گیا، لیکن کچھوے نے فوراً پانی میں سے اپنا سر نکالا اور بندر سے کہا۔ "دوست تمہارا شکریہ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میرا گھر پانی ہی میں ہے!"

۴

جنگلی ہرن اور چُونے کا گڑھا

[جنگلی ہرن انڈونیشیا کا بہت چالاک جانور ہے۔ اسے وہاں "کنچل" (KANTCHIL) کہتے ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ شیر، مگرمچھ اور ہاتھی جیسے خونخوار جانور بھی اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی عوامی کہانیوں میں جنگلی ہرن کا اکثر ذکر ہے۔

یہ کہانی انڈونیشیا کی داستانوں "جنگلی ہرن اور چونے کا گڑھا اور دوسری داستانیں" سے لی گئی ہے جسے ہیرالڈ کورلینڈر نے مرتب کیا اور "ہارکورٹ بریس اینڈ کمپنی" قائم شدہ نیویارک نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔]

ایک دفعہ ایک جنگلی ہرن ایک کسان کے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ کسان اور اس کی بیوی اس وقت کھیت میں کام کرنے گئے تھے، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جنگلی ہرن نے اندر جھانکا اور دیکھا کہ کمرے میں میز پر ایک کیک کیلے کے بڑے سے پتے میں لپٹا ہوا رکھا ہے۔ کیک کو دیکھ کر ہرن کے منہ میں پانی بھر آیا، وہ کمرے میں داخل ہوا اور چپکے سے کیک اٹھا کر اپنا راستہ لیا۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور کیک کھاتا جاتا تھا۔ راستے میں تھا ایک چونے کا گڑھا، ہرن کیک کھانے میں مشغول تھا۔ اس لئے اس کو

گڑھا دکھائی نہیں دیا اور وہ دھڑام سے اس گڑھے میں جا پڑا۔

جب اس کو ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو گڑھے میں پایا اور دیکھا تو کیلے کا خالی پتہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس نے زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ قریب ہی ایک سؤر گزر رہا تھا، جب اس نے ہرن کی چیخ سنی تو گڑھے میں جھانکا، ہرن نے آہٹ سن کر جھٹ سے کیلے کا پتہ منہ کے سامنے کر لیا۔ جیسے وہ کچھ پڑھ رہا ہو، اور بولا "سنو آج کا دن بہت منحوس ہے، جو بچنا چاہتا ہے وہ اس مقدّس غار میں پناہ لے" سؤر نے کہا "کون کہتا ہے کہ آج کا دن منحوس ہے؟" ہرن بولا "کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ میں مقدّس کتاب کا ورق پڑھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں" اور اس نے پھر آواز لگائی۔ "آج دنیا تباہ ہو جائے گی" اس پر سؤر بولا "اچھا میں بھی اس غار میں پناہ لیتا ہوں" ہرن چلایا کہ "تم گندے ہو تم یہاں نہیں آسکتے" سؤر بولا "نہیں میں ضرور آؤں گا۔" ہرن بولا "نہیں تم چھینکتے ہو اور یہاں اس کی اجازت نہیں" سؤر نے وعدہ کیا کہ میں کبھی نہیں چھینکوں گا، اور یہ کہہ کر سؤر نے چونے کے گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔

ہرن نے پھر چیخنا شروع کیا "آج دنیا تباہ ہو جائے گا۔ آج کا دن بہت منحوس ہے"۔ قریب سے ایک شیر گزر رہا تھا جب اس نے یہ سنا تو گڑھے میں جھانکا اور بولا "تم کیا کر رہے ہو؟" ہرن بولا "حضور! آج سب تباہ ہو جائیں گے، صرف وہ بچیں گے جو اس مقدّس غار میں پناہ لیں گے" شیر نے کہا "مجھے بھی اس گڑھے میں آنے کی اجازت دو" سؤر بولا "حضور یہ مقدّس جگہ ہے۔ یہاں چھینکنے کی اجازت نہیں جو یہاں چھینکے گا، اسے غار سے باہر نکال دیا جائے گا" شیر نے یہ شرط مان لی اور گڑھے میں کود پڑا۔

ہرن نے پھر کیلے کے پتے کو دیکھتے ہوئے آواز لگائی "آج سب تباہ ہو جائیں گے، یہ بڑا منحوس دن ہے" اتنے میں ایک ہاتھی وہاں سے گزرا اور آواز سن کر گڑھے

کے پاس آیا اور بولا تم سب یہاں کیا کر رہے ہو۔ شیر نے کہا آج کا دن بہت منحوس ہے۔ جو یہاں پناہ لے گا وہ بچ جائے گا۔ ہاتھی نے بھی گڑھے میں کودنے کی تیاری کی۔ مگر ہرن نے اجازت نہ دی اور بولا "تم یہاں چھینکو گے اور اس غار میں چھینکنا منع ہے" ہاتھی نے وعدہ کیا "کہ وہ ایسا نہیں کرے گا اور وہ بھی گڑھے میں اتر آیا۔ ہرن نے پھر چیخنا شروع کیا "آج کا دن بہت منحوس ہے جو یہاں پناہ لے گا، وہ بچ جائے گا" اتنے میں ایک طرف سے کچھ آواز سی آئی، شیر بولا "یہ کس نے چھینک لی" سب جانور ایک دم چلّائے "ہرن چھینکا ہے، ہرن کو باہر پھینک دو، اُس نے مقدس غار کو گندا کر دیا ہے" اور سب نے غصے میں جنگلی ہرن کو اٹھا کر چوہے کے گڑھے سے باہر پھینک دیا۔

مشرقی و جنوبی ایشیا



۵

طوطا انسان کی بولی کیوں بولتا ہے

[اس کہانی میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ٹوٹیاں طوطا لوگ گھروں میں کیوں پالنے لگے اور قبیلے کے ایک اور چھوٹے طوطے "لوری کیٹ" کو جسے پہلے پالتے تھے کیوں آزاد کر دیا، یہ کہانی دو مختلف روایتوں پر مبنی ہے ان میں سے ایک زبانی کہاوت ہے اور دوسری "ہند بعید" کی قدیم حکایت ہے جسے "کے این فلی سن ریول اینڈ کمپنی" نے ۱۸۹۹ء میں شائع کیا۔ اس کہانی میں انصاف کے ناجائز استعمال کی مثال پیش کی گئی ہے۔]

پرانے زمانے کا ذکر ہے۔ ایک ننھا ٹوٹیاں طوطا جو آزادی سے جنگلوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ اور ایک ننھا آسٹریلیا کا چھوٹا طوطا لوری کیٹ، لوگ اس کو گھروں میں شوق سے پالتے اور بولنا سکھاتے۔ لوری کیٹ بڑا سمجھ دار جانور تھا۔ وہ خوب باتیں کیا کرتا وہ آدمیوں کو جو کچھ کرتے اور بولتے دیکھتا فوراً ان کی نقل کر لیتا، اس کی بول چال بالکل انسانوں کی سی تھی۔ ایک گاؤں میں ایک کسان نے لوری کیٹ پال رکھا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ اس کسان نے ایک بھینس کو دھان کے کھیت میں چرتے دیکھا۔ یہ بھینس اس کے ہمسائے کی تھی۔ کسان نے بھینس کو پکڑ کر ذبح کر ڈالا اور اس

کے گوشت کے ٹکڑے کر کے کچھ تو کھا لیا اور کچھ چاولوں کے پیپے میں بند کر دیا۔ پھر اس پیپے کو اس نے چاولوں کے گودام کی چھت پر چھپا دیا۔ دوسرے دن ہمسایہ اپنی بھینس کو ڈھونڈتا ہوا آیا تو کسان سے پوچھنے لگا۔ "تم نے میری بھینس دیکھی ہے"۔ کسان نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم۔ میں نے نہیں دیکھی" کسان کا طوطا لوری کیٹ پنجرے میں بند ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "میرے مالک نے تمہاری بھینس کے ٹکڑے کیے ہیں کچھ گوشت کھایا ہے اور کچھ چاولوں کے پیپے میں بند کر کے کوٹھڑی کی چھت پر رکھ دیا ہے" کسان بہت گھبرایا۔ ہمسائے نے اس کے گھر کی تلاشی لی، وہاں گوشت چھپا رکھا تھا۔ کسان نے بات بنانے کو کہا "یہ گوشت تمہاری بھینس کا نہیں ہے، یہ کسی اور ہی جانور کا ہے۔ میں اپنے گھر کا گوشت اسی جگہ رکھتا ہوں" لوری کیٹ نے پھر کہا "نہیں، نہیں، یہ سب جھوٹ ہے، یہ گوشت تمہاری بھینس کا ہے" ہمسائے کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے کسان کو سچا مانے یا طوطے کی بات پر یقین کرے۔

آخر ہمسایہ عدالت پہنچا اور کسان کے خلاف مقدمہ کر دیا۔ عدالت نے کسان کو حکم دیا کہ دوسرے دن عدالت میں حاضر ہو کر جواب دے۔ کسان کو طوطے پر سخت غصہ آیا اس نے رات کو اسے پنجرے سے نکالا اور پیتل کے ایک بڑے سے برتن میں بند کر دیا پھر اس برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا۔ موسم سہانا تھا اور چاندنی رات تھی۔ مگر لوری کیٹ بیچارا اندھیرے میں بند پھڑک رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کسان نے اس برتن کو زور زور سے زمین پر پٹکنا شروع کر دیا اور خوب پانی پھینکا، جب صبح ہوئی تو لوری کیٹ کو برتن سے نکال کر پھر اس کے پنجرے میں بند کر دیا اور اس پنجرے کو لے کر عدالت کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب مقدمہ شروع ہوا تو ہمسائے نے حاکم عدالت سے کہا "لوری کیٹ نے

مجھے بتایا تھا کہ میری بھینس کو کسان نے مارا ہے"۔ حاکم نے طوطے سے اصل واقعہ پوچھا۔ اس نے پنجرے میں سے جواب دیا "حضور کسان نے بھینس کو مارا تھا، کچھ گوشت اس نے کھایا اور کچھ چاولوں کے پیپے میں کوٹھڑی کی چھت پر چھپا دیا" کسان نے کہا "حضور جو گوشت پیپے میں بند چھت سے ملا وہ کسی اور جانور کا تھا۔ میں حیران ہوں کہ سب لوگ اس بیوقوف پرندے کی بات پر تو یقین کرتے ہیں مگر میرے بیان پر کسی کو یقین نہیں"۔ حاکم نے کہا "لوری کیٹ سمجھدار پرندہ ہے"۔ کسان بولا "حضور یہ پرندہ اکثر غلط بیانی بھی کرتا ہے ابھی میں اس سے آپ کے سامنے ایک سوال کرتا ہوں کہ گذشتہ رات کیسا موسم تھا؟ دیکھئے یہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ"۔ حاکم نے لوری کیٹ سے کہا "جواب دو" پرندہ بولا "حضور رات سخت اندھیری تھی، بادل گرج رہے تھے اور بارش ہو رہی تھی"۔

کسان نے حاکم سے کہا "حضور نے سُن لیا۔ گذشتہ رات تو چاند نکلا ہوا تھا اور موسم کتنا سہانا تھا۔ کیا آپ اب بھی اس پرندے کی بات کا یقین کرتے ہیں؟ اس پر حاکم اور دوسرے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ کسان بے گناہ ہے اور طوطا جھوٹا ہے۔ عدالت نے کسان کو چھوڑ دیا۔ کسان نے واپس آ کر غصے میں لوری کیٹ کو ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا اور وہ ہنسی خوشی جنگل میں رہنے لگا۔

ایک دن لوری کیٹ نے جنگل میں ایک نیا پرندہ دیکھا۔ جس کے پر سبز اور سرخ رنگ کے تھے، اس نے نئے پرندے سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ نئے پرندے نے کہا "مجھے ٹوئیاں طوطا کہتے ہیں۔ میں جنوب سے آیا ہوں اور اب اس ملک میں رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں انسانوں کی بولی بھی جانتا ہوں"۔ لوری کیٹ نے طوطے سے کہا۔ "اس ملک میں خوشی سے آباد ہو مگر تم اجنبی ہو، اس لئے میری ایک نصیحت سن لو اور گرہ میں باندھ رکھو، میں بھی انسان کی بولی جانتا تھا اور

لوگوں کے گھروں میں رہتا تھا۔ میں نہ صرف ان کی باتیں دُہراتا تھا بلکہ خود بھی ان کی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ لیکن انسان کو یہ بُرا لگا کہ میں سچ بولتا ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ بولنا سکھائیں میں صرف وہی دہراؤں۔ اس لئے میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اگر تم سلامتی چاہتے ہو تو صرف وہی بولنا جو انسان سکھائے، اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہنا" ٹوئیاں طوطے نے لوری کیٹ کا شکریہ ادا کیا اور اس کی نصیحت مان لی۔ اس دن سے ٹوئیاں طوطا انسان کے پاس پنجرے میں رہتا ہے اور صرف وہی الفاظ دہراتا ہے جو اُسے انسان سکھاتا ہے۔

٦

پادری اور ناشپاتی کا درخت

[یہ کہانی "چینی اسٹوڈیو" نامی عجیب وغریب کہانیوں کی کتاب سے لی گئی ہے جسے ہربرٹ گائلز نے مرتب کیا اور تھامس ڈی لارلو کمپنی نے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا۔ یہ مصنف کے ایک دوسرے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔ جسے "چینی پرستان کی کہانیاں" کے نام سے "گوانس اینڈ گرے" نے شائع کیا۔]

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک گاؤں کی منڈی میں ایک کسان ناشپاتیوں کی گاڑی لایا۔ یہ ناشپاتیاں بہت عمدہ تھیں۔ اس لئے لوگ گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ اتنے میں ایک پادری پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہاں آیا اور اس نے کسان سے ایک ناشپاتی مانگی۔ لیکن کسان کنجوس اور بے مروّت تھا۔ اس نے ناشپاتی دینے سے انکار کر دیا۔ غریب پادری وہیں کھڑا رہا اور ناشپاتیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کسان کو بہت غصہ آیا۔ اس نے پادری سے کہا "تم یہاں سے جاتے کیوں نہیں؟" پادری نے کہا "بھلے آدمی تیرے پاس سینکڑوں ناشپاتیاں ہیں۔ اگر ان میں سے مجھے ایک ناشپاتی دے دیتا تو کیا ہو جاتا؟" لوگوں کے ہجوم میں سے ایک شخص بولا "اگر تم

ابھی ناشپاتی نہیں دے سکتے تو اس غریب کو ایک خراب ناشپاتی ہی دے دو۔ کسان کو اور بھی غصہ آیا، اس نے کہا "میں نے خون پسینہ ایک کر کے یہ ناشپاتیاں پیدا کی ہیں۔ میں انہیں منڈی میں بیچنے کے لئے آیا ہوں۔ خیرات کرنے کے لئے نہیں لایا۔"

اس پر ایک شخص آگے بڑھا، اس نے ناشپاتی کی قیمت کسان کو دیتے ہوئے کہا کہ "لو ایک ناشپاتی اس پادری کو دے دو"۔ کسان نے پیسے لے کر ایک ناشپاتی پادری کو دے دی۔ پادری بولا "میں حیران ہوں کہ خدا نے اس کسان پر اتنی مہربانی کی ہے۔ مگر یہ ایک ناشپاتی بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔ جب میں پادری بنا تو میں نے اپنا گھر، روپیہ پیسہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ میرے پاس اس وقت ناشپاتیوں سے لدا ہوا ایک درخت ہے اگر تم لوگ کچھ دیر ٹھہرو تو اس کی ناشپاتیاں کھا سکتے ہو"۔ ایک شخص بولا "اگر تمہارے پاس ناشپاتی کا درخت ہے تو تم مانگ کیوں رہے ہو؟" پادری نے کہا "میاں ناشپاتی کا یہ درخت تو میں ابھی لگاؤں گا" یہ کہہ کر اس نے جلدی سے ناشپاتی اور اس کا ایک بیج زمین میں ڈال دیا۔ پھر پانی منگوا کر اس پر ڈالا، لوگ پادری کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے اور اسے بے وقوف سمجھ رہے تھے تھوڑی دیر میں زمین سے ایک پودا نکل آیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑا اونچا درخت بن گیا اور ناشپاتیوں سے لد گیا۔

لوگ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ پادری نے درخت سے ناشپاتیاں توڑ کر سب میں ایک ایک بانٹ دی۔ کسان بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ جب سب ناشپاتیاں ختم ہو گئیں، تو پادری نے درخت کو کلہاڑی سے کاٹ دیا اور اپنے کندھے پر درخت کو اٹھا کر چل دیا، جب کسان نے مڑ کر اپنی گاڑی کو دیکھا تو وہ خالی تھی کسان کو فوراً خیال آیا کہ پادری نے جو ناشپاتیاں لوگوں کو بانٹی تھیں، وہ اصل میں میری

تھیں، وہ غصے میں پادری کی تلاش میں دوڑا۔ مگر بے کار، کیونکہ پادری نظروں سے غائب ہو چکا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ پادری نے کنجوس کسان سے انوکھا مذاق کیا ہے تو لوگ بہت خوش ہوئے اور کسان اپنا سا منہ لے کر منڈی سے واپس چلا گیا۔

۷

چار نوجوان

[یہ کہانی "قدیم برمی داستانیں" مرتبہ مونگ ہتن آنگ، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی (۱۹۴۸ء) اخذ کی گئی ہے جو خیالی اور بے بنیاد قصوں پر مبنی ہے۔ برما کی یہ قدیم داستانیں جنوب مشرق اور جنوبی ایشیا میں طرح طرح سے مشہور چلی آتی ہیں، لیکن ان میں ایک خاص لطف اور مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ برمی لوگوں میں ان کے جانوروں کے بہت سے قصے مشہور ہیں جن میں خرگوش اپنی عیاری کے عجیب کارناموں کے لئے مانا ہوا ہے، اس کے کارنامے انڈونیشیا کے جنگلی ہرن سے ملتے جلتے ہیں اور بہت سی بہادری کی قدیم داستانوں میں مشہور ہیں۔ ان داستانوں کے ٹکڑے ایشیا کے اور مقامات میں بھی ملتے ہیں اس کی ایک مثال کہانی "جھوٹوں کا مقابلہ" ہے جو "ٹوپی کا ناچ" مرتبہ ہیرلڈ کورلینڈ، مطبوعہ ہارکورٹ بریس اینڈ کمپنی (قائم شدہ نیویارک ۱۹۵۶ء) میں ملتی ہے۔]

ایک گاؤں میں چار نوجوان رہتے تھے، جنہیں جھوٹے سچے قصے سنانے کی

عادت تھی۔ ایک دن انہوں نے ایک مسافر کو سرائے میں دیکھا۔ جس کا لباس بہت عمدہ تھا ان نوجوانوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ کسی طرح اس مسافر کے کپڑے چھین لئے جائیں کچھ دیر سوچنے کے بعد یہ طے ہوا کہ اس مسافر کے سامنے یہ تجویز رکھی جائے کہ ہم میں سے ہر شخص ایک ایک قصہ سنائے اور سننے والوں میں جو کوئی کسی کے قصے پر شک کرے وہ قصہ سنانے والے کا غلام بن جائے اور اپنے کپڑے اتار کر اس کے حوالے کر دے چنانچہ وہ چاروں نوجوان مسافر کے پاس گئے اور اس کو اپنی یہ تجویز سنائی۔ مسافر نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اس پر گاؤں کے چودھری کو وہاں بلایا گیا تاکہ وہ انصاف کرے۔ اس کے بعد پہلے نوجوان نے اپنا قصہ یوں شروع کیا۔ "دوستو! ابھی میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ میری ماں نے میرے باپ سے کہ کچھ آلوچے باہر درخت سے اتار لاؤ۔ میرے باپ نے کہا درخت بہت اونچا ہے میں نہیں چڑھ سکتا میری ماں نے میرے بھائیوں سے کہا انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ مجھے اپنی ماں پر بہت ترس آیا اور میں سب کی آنکھ بچا کر درخت پر چڑھ گیا اور آلوچے لا کر میز پر رکھ دیئے۔ اب سب حیران تھے کہ یہ آلوچے کہاں سے آ گئے" یہ قصہ سنا کر اس نے مسافر کی طرف دیکھا کہ وہ ضرور شک کرے گا۔ مگر مسافر نے اطمینان سے کہا۔ "قصہ بالکل سچ ہے"۔

اب دوسرے نوجوان کی باری تھی، اُس نے اپنا قصہ شروع کیا "بھائیو! جب میں سات دن کا تھا تو ایک جنگل میں گیا۔ جہاں کھجور کا بہت اونچا درخت تھا۔ میں بہت بھوکا تھا۔ اس لئے کھجوریں کھانے کے لئے درخت پر چڑھ گیا اور خوب پیٹ بھر کر کھجوریں کھائیں جب پیٹ بھر گیا تو نیچے اترنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر میں گاؤں میں گیا۔ وہاں سے ایک سیڑھی لایا، پھر درخت کے ساتھ سیڑھی لگا کر نیچے اترا۔ اگر یہ سیڑھی نہ ہوتی تو میں آج تک درخت پر لٹکا ہوتا!"

یہ قصہ سُنا کر اس نے بھی مسافر کی طرف دیکھا۔ مسافر نے کہا "بہت دلچسپ قصہ

اب تیسرے نوجوان نے اپنا قصہ شروع کیا۔ وہ بولا "دوستو! جب میں ایک سال کا تھا تو میں نے دیکھا ایک خرگوش بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا، آخر میں نے اسے پکڑ لیا۔ جب وہ میرے ہاتھ آگیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ خرگوش نہیں بلکہ شیر تھا۔ شیر نے مجھے کھانے کے لئے اپنا منہ کھولا۔ میں نے عاجزی سے کہا کہ حضور میں نے آپ کو خرگوش سمجھا تھا، مجھے معاف کر دیجئے۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس پر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے اس کے اس زور کا تھپڑ رسید کیا کہ شیر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔" مسافر نے یہ قصہ سن کر کہا "تم بالکل سچ کہتے ہو۔"

اب چوتھے نوجوان کی باری تھی۔ اس نے کہا "دوستو! گذشتہ سال میں ایک کشتی میں بیٹھ کر مچھلی کا شکار کھیلنے دریا پر گیا۔ بہت کوشش کے بعد بھی کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی۔ پھر میں نے وہاں کے مچھیروں سے پوچھا۔ وہ کہنے لگے ہم نے بھی مدت سے کوئی مچھلی یہاں نہیں پکڑی۔ میں نے سوچا کہ دریا کی تہ میں جا کر دیکھا جائے کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر اللہ کا نام لے کر میں نے دریا میں چھلانگ لگائی اور تین دن کے بعد دریا کی تہ میں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑی مچھلی بیٹھی ہے جو چھوٹی مچھلیوں کو کھا رہی ہے۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی، میں نے بڑی مچھلی کو مکے مار مار کر ختم کر دیا۔ پھر آگ سلگا کر مزے سے اسے بھون کے کھایا اور واپس اپنے گھر آگیا۔" یہ قصہ ختم کر کے اس نے مسافر کی طرف دیکھا۔ مسافر بولا "بالکل سچ کہا تم نے۔"

اب مسافر کی باری تھی۔ اس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا: "چند سال ہوئے میرا باغ تھا جس میں ایک عجیب قسم کا درخت تھا۔ اس کی چار ٹہنیاں تھیں، اور ہر ٹہنی میں ایک پھل تھا۔ جب پھل پک گئے تو میں نے چاروں پھلوں کو اتار کر کاٹا۔ ہر پھل میں سے ایک نوجوان نکلا۔ چونکہ وہ میرے درخت میں سے نکلے تھے، لہٰذا میں نے انھیں اپنا غلام بنا

کر اپنے کھیت پر کام کرنے کو بھیج دیا۔ مگر وہ چاروں بہت کام چور تھے اور دن بھر گپیں ہانکتے تھے۔ آخر وہ کام سے تنگ آکر وہاں سے بھاگ گئے۔ میں بھی ان کی تلاش میں چل پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ چاروں مل گئے اور اب میرے سامنے بیٹھے ہیں۔" یہ کہہ کر مسافر نے چاروں نوجوانوں سے کہا "تم چاروں میرے بھاگے ہوئے غلام ہو۔ اب میرے ساتھ واپس چلو اور کام کرو۔"

یہ قصہ سُن کر چاروں نوجوان بہت پریشان ہوئے اگر وہ یہ کہتے کہ یہ قصہ جھوٹا ہے تو شرط ہار جاتے لہذا خاموش رہے۔ گاؤں کے چودھری نے نوجوانوں سے کہا کہ "بولتے کیوں نہیں مسافر کا قصہ سچ ہے یا جھوٹ؟" نوجوان پھر بھی خاموش رہے۔ آخر چودھری نے کہا "مسافر شرط جیت گیا ہے لہذا تم چاروں اب اس کے غلام ہو۔" مسافر نے کہا "چونکہ تم میرے غلام ہو، لہٰذا فوراً کپڑے اتار دو، پھر میں تمہیں آزاد کردوں گا۔" اس پر چاروں نوجوانوں نے اپنے کپڑے اُتار کر مسافر کے حوالے کردیے، مسافر نے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور اپنا راستہ لیا۔ وہ چاروں نوجوان ننگے کھڑے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور مسافر چلا گیا۔

۸

بہادر کمہار

[یہ بھارت کی ایک قدیم کہانی ہے جس کا طنز و مزاح امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں ایسی کہانیاں اکثر ملتی ہیں جن میں ایک معمولی آدمی محض اتفاقیہ طور پر ہیرو بن جاتا ہے اور ایک خودساختہ سورما کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے (یہ کہانی شمالی داستان "انگیل شلٹ کی جنگ" اور آدی نفاس کا ہیروؔ" سے ملتی جلتی ہے جو کور لینڈر اور ریسلا کے مجموعہ "پہاڑ پر آگ" اور ایتھوپیا کی دوسری کہانیاں" میں شامل ہیں اور جنھیں "ہنری ہولٹ اینڈ کمپنی نیو یارک" نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ "بہادر کمہار" کی کہانی "تارا سرکار" کی کتاب "بھارتی کہانیاں" سے اخذ کی گئی ہے، اس کو "جنرل پرنٹرز پبلشرز" کلکتہ نے ۱۹۵۱ء میں دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ "میری فریئر" کی کتاب "دکن کے قدیم ایام" میں بھی ملتا ہے۔]

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک گاؤں کے نزدیک ایک شیر پھر رہا تھا۔ اچانک آندھی اور بارش کا سخت طوفان آگیا۔ شیر گاؤں میں گھس گیا اور ایک جھونپڑی کے قریب پناہ لی۔ اس جھونپڑی میں ایک بڑھیا رہا کرتی تھی۔ سخت بارش ہونے کی وجہ سے جھونپڑی

کی چھت ٹپک رہی تھی۔ بڑھیا اپنا سامان بارش سے بچانے کے لیے ادھر ادھر رکھ رہی تھی شیر باہر سے یہ سب آوازیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیسا شور ہے؟ بڑھیا بار بار کہہ رہی تھی کہ "اس ٹپکے سے تو میں بڑی پریشان ہو گئی ہوں، اس نے تو میرا سارا مال اسباب غارت کر دیا ہے۔ اس ٹپکے سے بچ کر آخر میں کہاں جاؤں"۔

شیر یہ سن کر سوچنے لگا یہ ٹپکا کیا بلا ہے جو بڑھیا اس سے اس قدر خوف کھا رہی ہے۔ ہو نہ ہو یہ کوئی بہت ہی خوفناک جانور ہے۔ اتنے میں ایک کمہار ادھر آنکلا۔ جس کا گدھا بارش کے طوفان میں کہیں بھاگ گیا تھا۔ اندھیرے میں اس کی نظر شیر پر پڑی۔ وہ سمجھا کہ "یہی میرا گدھا ہے" وہ دوڑ کر شیر کی طرف لپکا اور دھڑا دھڑ لاتیں مارنی شروع کر دیں۔ اب جو شیر پر ایک دم لاتیں پڑنی شروع ہوئیں تو وہ سمجھا کہ بڑھیا کا "ٹپکا" ادھر آگیا ہے اور اس نے مجھے بھی یہاں چھپے دیکھ کر مارنا شروع کر دیا ہے۔ شیر سہم کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ ادھر کمہار برابر شیر کو مار رہا تھا اور کہتا جاتا تھا "چل گھر چل! ابھی تیری اچھی طرح خبر لوں گا" اس کے بعد کمہار شیر پر چڑھ بیٹھا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر کمہار نے شیر کو ایک طرف دروازے میں باندھ دیا اور جاکر سو رہا۔ صبح ہی صبح کمہار کی بیوی سو کر اٹھی تو اس نے شیر کو اپنے دروازے میں بندھا دیکھا۔ وہ بھاگی ہوئی اندر آئی اور اپنے میاں سے کہا "رات تم نے کس جانور کو لا باندھا تھا ذرا چل کر دیکھو وہاں تو ایک شیر بندھا ہے کمہار جلدی سے اٹھ کر باہر آیا اور دروازے میں شیر کو بندھا دیکھ کر مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا۔

ذرا دیر میں یہ خبر تمام گاؤں میں پھیل گئی کہ کمہار نے ایک شیر کو قید کر لیا ہے جب اس شہر کے راجا کو پتا چلا تو وہ بھی اس کے گھر شیر کو دیکھنے کے لئے آیا، اور یہ دیکھ کر اور بھی حیران ہوا کہ یہ وہی شیر ہے جس نے گاؤں میں اودھم مچا رکھا ہے اور روزانہ ایک نہ ایک

گاؤں والا اس کی نذر ہوتا ہے۔ غرض راجا کمہار کی بہادری پر بہت خوش ہوا۔ کمہار کو اپنی فوج کا سردار بنا کر اسے دس ہزاری کا خطاب دیا اور اس کے علاوہ بہت سی دولت بھی اسے دی۔ اب کمہار اور اس کی بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

کچھ عرصے کے بعد کسی اور بادشاہ نے راجا کے ملک پر حملہ کر دیا، راجا سخت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے تمام امیروں اور وزیروں کو بلایا اور فوج تیار کرنے کا حکم دیا لیکن اب سوال یہ تھا کہ فوج کی کمان کون سنبھالے گا؟ تمام امیروں وزیروں نے باری باری انکار کر دیا۔ آخر راجا نے بہادر کمہار کو بلایا اور فوج کی کمان اس کے سپرد کی۔ کمہار مجبوراً راضی تو ہو گیا لیکن بادشاہ سے کہا کہ "میں اکیلا ہی فوج کے مقابلہ کو جاؤں گا" بادشاہ نے منظور کر لیا۔ کمہار دل میں بہت ڈرا اور گھر آ کر اپنی بیوی سے ذکر کیا، بیوی بھی بہت پریشان ہوئی۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ نے اپنا بہترین گھوڑا کمہار کو بھیجا کہ وہ اس پر سوار ہو کر دشمن کی فوج کو دیکھنے جائے۔ کمہار اپنی زندگی میں کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس گھوڑے کو دیکھ کر وہ بہت ڈرا اور بیوی سے کہنے لگے "میں گھوڑے پر بیٹھ جاتا ہوں، تو ایک موٹا سا رسا لے کر مجھے گھوڑے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دے۔" آخر کمہار بڑی مشکل سے گھوڑے پر بیٹھا اس کی بیوی نے ایک رسا لے کر کمہار کو گھوڑے کی گردن سے باندھ دیا گھوڑا گھبرا کر بھاگ نکلا کمہار گھوڑے پر جوں توں بیٹھ تو گیا۔ مگر اس کا بہت برا حال تھا اور گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ راستے میں کیلے کا درخت آیا۔ گھوڑا جب اس کے قریب سے گذرا تو کمہار نے اپنی جان بچانے کی خاطر درخت کو پوری طاقت سے پکڑ لیا، درخت جڑ سے اکھڑ گیا لیکن گھوڑے کو اس کی پروا بھی نہ ہوئی وہ اسی طرح بھاگتا رہا اور کیلے کا درخت، کمہار کے ہاتھ میں گھسٹتا رہا۔

اتفاق سے گھوڑا دشمن کی فوج میں جا گھسا۔ جب فوجیوں نے دیکھا کہ ایک سوار

بہت بڑا درخت ہاتھ میں لئے ہماری طرف آرہا ہے تو وہ بہت ڈرے اور اپنے سردار سے کہنے لگے کہ "ہم اس سورما راجا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جس کے سردار اس قدر بہادر ہیں"۔ سردار نے فوراً اپنی فوج کو واپس جانے کا حکم دے دیا اور ایک خط لکھ کر خیمے میں رکھ دیا۔ "آئندہ ہم آپ کے ملک پر کبھی حملہ نہیں کریں گے"۔ ادھر کمہار کا گھوڑا تھک چکا تھا وہ خیمے کے قریب آکر رُک گیا، کمہار نے غنیمت سمجھا اور وہیں اتر گیا۔ کیونکہ وہ تھک کر بے دم اور زخمی ہو چکا تھا، اس لئے آگے نہ جا سکا اور خیمے میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب کمہار کو ہوش آیا تو وہاں ایک خط پڑا دیکھا۔ اس نے وہ خط اٹھایا اور خوشی خوشی واپس گھر کی طرف چل دیا۔

کمہار نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی کو سارا قصہ سنایا اور کہا کہ اب تم یہ خط راجا کو دے آؤ۔ کمہار کی بیوی نے اسی وقت وہ خط راجا کو جا کر دیا اور کہا کہ میرا خاوند دشمن کو بھگا کر آیا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے، اس لئے صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا"۔ راجا نے جب خط پڑھا تو اس کو معلوم ہوا کہ دشمن کی فوجیں واپس چلی گئی ہیں۔ وہ کمہار کی بہادری پر بہت خوش ہوا۔

دوسرے دن کمہار دربار میں پہنچا تو تمام امیر غریب اس کے استقبال کو جمع تھے راجا نے بھی اسے بڑی عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور بہت انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ اس دن سے ہر جگہ کمہار کی بہادری کا چرچا ہو گیا، اور اس ملک میں اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔

۹

چار پہیلیاں

[یہ کہانی دو روایتوں پر مبنی ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ جو شخص پہیلیوں کے جواب دیتا ہے، وہ ایک بادشاہ تھا جس کے چار لڑکے پتھر بن گئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق جو کراچی میں سنی گئی، جواب دینے والا شخص ایک ادنیٰ کاریگر تھا لیکن اس اصل کہانی کا مواد "کشمیر کی عوامی کہانیاں" نامی کتاب سے لیا گیا ہے جسے "جے ہنٹن ناؤلز" نے مرتب کیا اور کیگن پال ٹرینچ ٹرنبر اینڈ کمپنی لندن" ۱۸۹۳ء میں شائع کیا جس میں اس کا عنوان تھا "چار شہزادے جو پتھر بن گئے"۔]

کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک غریب لکڑہارا رہا کرتا تھا جو اپنی دانائی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے اس ملک کے بادشاہ کو اس کی دانائی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے وزیروں سے پوچھا کہ "کیا واقعی لکڑہارا بہت عقلمند ہے" وزیروں نے جواب دیا کہ "آپ خود ہی اس کا امتحان لے کر دیکھیں" ان میں سے ایک وزیر نے کہا کہ "لکڑہارا بہت غریب اور نیک انسان ہے، اس کے چار بیٹے ہیں، وہ اتنا عقلمند ہے کہ وہ ہر پہیلی اور مشکل سوال کا جواب دے سکتا ہے۔"

بادشاہ نے ایک فقیر کو طلب کیا جو جادو جانتا تھا۔ اس نے فقیر سے کہا کہ "ایک لکڑہارا ہے جس کے چار بیٹے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بہت ہی عقلمند ہے، تم اُس سے ایسی مشکل پہیلیاں پوچھو جن کا وہ جواب نہ دے سکے۔ اگر اس نے ان پہیلیوں کا جواب نہ دیا تو اسے سخت سزا دی جائے گی اور جواب دے دیا تو ہم خوش ہو کر اسے بہت سا انعام واکرام دیں گے۔

فقیر اس گاؤں کے قریب جنگل میں پہنچا جہاں وہ غریب لکڑہارا روزانہ لکڑیاں کاٹنے آتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن لکڑہارے کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ لکڑیاں کاٹنے نہ جا سکا۔ اس نے اپنے بڑے لڑکے کو بلایا اور کہا "آج میری طبیعت خراب ہے، تم جنگل سے لکڑیاں کاٹ لاؤ۔" بڑا لڑکا اپنے باپ کا حکم سن کر جنگل میں پہنچا۔ وہاں اس نے ایک فقیر کو بیٹھے دیکھا تو اس سے پوچھا "بابا تم بڑے بزرگ اور بہت ہی عقلمند معلوم ہوتے ہو، کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرا مستقبل کیا ہے؟" فقیر نے کہا "میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں، بتاؤ وہ کیا ہے، پھر میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا" لڑکا اس بات پر راضی ہو گیا۔ فقیر نے اسی وقت جادو کے زور سے وہاں ایک باغ لگا دیا جس کے چاروں طرف لکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ لکڑیاں چھریوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں اور ان چھریوں نے باغ کی ساری گھاس کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد وہ باغ ایک دم غائب ہو گیا۔ فقیر نے لڑکے سے پوچھا "بتاؤ یہ سب کچھ کیا تھا؟" لڑکا بولا "میں نہیں سمجھ سکا" فقیر نے کہا۔ "اچھا اب میں تمہارا مستقبل بتاتا ہوں۔ جاؤ تم پتھر کے بن جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکے کو پتھر کا بنا دیا۔

رات کو جب لکڑہارے کا لڑکا واپس نہ آیا تو اس نے صبح کو اپنے منجھلے لڑکے کو بڑے لڑکے کی تلاش میں بھیجا۔ جب وہ لڑکا جنگل میں پہنچا تو اس نے بھی فقیر کو بیٹھے دیکھا۔

اس نے فقیر سے کہا "بابا تم بہت نیک معلوم ہوتے ہو، کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت میرا بڑا بھائی کہاں ہے؟" فقیر نے کہا "ہاں، پہلے تم میری بات کا جواب دو" یہ کہہ کر فقیر نے اپنے جادو کے زور سے وہاں ایک جنگل بنا دیا۔ جس میں ایک گائے اور اس کا بچھڑا کھڑے تھے گائے نے اپنے بچھڑے کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں جانور نظروں سے غائب ہو گئے۔ فقیر نے لڑکے سے پوچھا "بتاؤ یہ کیا تھا؟" لڑکے نے جواب دیا "میں تو کچھ نہیں سمجھ سکا، میرے لئے تو یہ ایک معمہ ہے۔" فقیر نے کہا "اچھا تو میں تمہیں بھی تمہارے بڑے بھائی کے پاس بھیج دیتا ہوں" اور وہ بھی پتھر بن گیا۔

اگلے دن لکڑہارے نے اپنے تیسرے لڑکے کو دونوں بھائیوں کی تلاش میں بھیجا۔ فقیر نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ پھر جادو کے زور سے ایک بوڑھا آدمی وہاں آیا۔ جس کی کمر پر لکڑیوں کا ایک بہت بڑا گٹھا رکھا ہوا تھا مگر وہ پھر بھی ادھر ادھر سے لکڑیاں چن رہا تھا۔ فقیر نے لڑکے سے کہا "بتاؤ یہ سب کچھ کیا تھا؟" لڑکے نے کہا "میں کچھ نہیں سمجھا، اس لئے میں نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا تھا" اس طرح اس نے تیسرے لڑکے کو بھی پتھر کا بنا دیا۔

ادھر لکڑہارا بہت پریشان ہوا، اس نے اپنے چوتھے لڑکے سے کہا کہ اب سوائے تمہارے یہاں کوئی نہیں ہے جس کو میں ان تینوں کی تلاش کے لئے بھیجوں۔ تم جاؤ اور اپنی کوشش سے ان کو تلاش کر کے لاؤ۔ جب چھوٹا لڑکا فقیر کے پاس پہنچا تو اس نے فقیر سے پوچھا کہ "آپ نے میرے بھائیوں کو دیکھا ہے؟" فقیر نے اس سے بھی وہی کہا جو ان تینوں سے کہا تھا اور جادو کے زور سے اس لڑکے کے سامنے ایک بڑا سا تالاب آ گیا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے تالاب کا پانی چھوٹے تالاب میں جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بڑا تالاب بالکل خشک ہو گیا۔ فقیر نے لڑکے سے کہا "بتاؤ

کیا سمجھے؟" لڑکے نے کہا "میں کچھ نہیں بتا سکتا" فقیر نے جب یہ سنا تو اسے بھی پتھر کا بنا دیا

جب چوتھا لڑکا بھی واپس نہ آیا تو لکڑہارا بہت ہی پریشان ہوا۔ آخر مجبور ہو کر وہ خود جنگل میں گیا۔ وہاں اس نے اسی فقیر کو بیٹھے دیکھا۔ لکڑہارے نے کہا "اے نیک انسان کیا تو نے میرے چاروں لڑکوں کو دیکھا ہے؟" فقیر نے کہا "ہاں میں نے ان سب کو پتھر کا بنا دیا ہے، کیونکہ انہوں نے بادشاہ کے حکم کے مطابق میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سامنے جو چار بُت نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارے لڑکوں کے ہیں۔ اگر تم میرے سوالوں کا جواب دو گے تو میں تمہارے چاروں لڑکوں کو پھر انسان بنا دوں گا۔ اگر تم بھی جواب نہ دے سکے تو تم بھی اپنے بیٹوں کی طرح پتھر کے ہو جاؤ گے" لکڑہارے نے کہا۔ "مجھے منظور ہے"۔ اس پر فقیر نے پہلی پہیلی جادو کے زور سے پیش کی اور ایک باغ ایک دم سامنے آ گیا۔ اس کے گرد لگی ہوئی لکڑیاں چھریاں بن گئیں اور باغ کی تمام گھاس کاٹ دی۔ لکڑہارے نے کہا "اس پہیلی کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس روپیہ امانت رکھا گیا جب روپے کا مالک اپنا روپیہ مانگنے آیا تو وہ نہ دے سکا، کیونکہ وہ اس کا تمام روپیہ خرچ کر چکا تھا" جوں ہی لکڑہارے نے بات ختم کی۔ اس کا بڑا لڑکا انسان بن گیا۔

اب فقیر نے دوسری پہیلی پیش کی جو بچھڑے اور گائے کی تھی۔ جس میں گائے اپنے بچھڑے کا دودھ پی رہی تھی۔ لکڑہارے نے کہا ایک ایسی سست عورت کی مثال ہے جو اپنی لڑکی کا کام اور بھی بڑھا دیتی ہے" یہ کہنا تھا کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی انسان بن گیا۔

پھر فقیر نے تیسری پہیلی پیش کی جو ایک بوڑھے کی تھی، وہ کمر پر لکڑیوں کا ایک بڑا گٹھا لادے ہوئے تھا مگر پھر بھی ادھر ادھر سے لکڑیاں چن رہا تھا۔ لکڑہارے نے

کہا "یہ ایسے شخص کی مثال ہے جو کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتا اور ہمیشہ لالچ کرتا ہے" یہ کہنا تھا کہ اس کا تیسرا لڑکا بھی اصلی حالت پر آگیا۔

اب فقیر نے تالاب والی آخری پہیلی پیش کی۔ جس میں بڑے تالاب کا پانی چھوٹے تالاب میں جا رہا تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ بڑا تالاب خشک ہو گیا۔ لکڑہارے نے کہا "یہ دنیا کی بے غرضی اور خود غرضی کی مثال ہے جس میں کچھ لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں، مگر انھیں اس کے صلے میں کچھ نہیں ملتا اور کچھ لوگ برابر لیتے رہتے ہیں مگر کسی کو کبھی دیتے کچھ نہیں۔" یہ کہنا تھا کہ چوتھا لڑکا بھی انسان بن گیا۔ اس پر فقیر نے کہا کہ "واقعی تم بہت دانا ہو۔ اگر تم ٹھیک جواب نہ دیتے تو تم بھی یہاں پتھر کے بن جاتے اور دوسرے لکڑہارے ان پتھروں پر اپنے کلہاڑے تیز کرتے۔ اب میں تمھاری دانائی کا حال بادشاہ کو بتا دوں گا۔" چنانچہ فقیر نے بادشاہ کو لکڑہارے کا حال سنایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور سونے سے بھرا ہوا ایک تھیلا بطورِ انعام لکڑہارے کو دیا۔

ایشیائی وافریقی مشرقِ وسطیٰ



۱۰

چولھے میں چاندی

[یہ کہانی "چند تازہ پشتو عوامی کہانیاں" سے لی گئی ہے، جسے ایف ایچ میلیون نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی یادداشت" جلد سوم مطبوعہ ۱۹۱۴ء سے اخذ کیا، دراصل یہ ایک طویل داستان "افسانہ در افسانہ" (تراہ کی نئی کہانی) کا ایک حصہ ہے جس کا مرکزی خیال عورت کی اس خاصیت پر مبنی ہے کہ وہ کبھی کسی بھید کو نہیں چھپا سکتی اور یہ خیال مشرق و مغرب کی اکثر عوامی کہانیوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کہانی میں اسی خیال کو کسی قدر نئے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے۔]

افغانستان کا ذکر ہے۔ کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ وہ بیچارا روزی کمانے کے لیے حد سے زیادہ محنت کرتا تھا۔ مگر اس کی گزر بسر مشکل سے ہوتی۔ وہ رات دن مزدوری کرتا اور بہت سادہ زندگی گزارتا، پھر بھی سال کے سال اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ بچ سکتا۔ ساری عمر اتنی مشقت کرتے رہنے پر بھی اس کی حالت ویسے ہی خراب تھی جیسے شروع میں۔

ایک دن وہ صبح کی نماز ادا کر کے سجدہ میں گر پڑا اور اللہ پاک سے گڑگڑا کر دعا

مانگنے لگا کہ "یا پروردگار! مجھے دولت عطا کر۔ اس دکھوں بھری دنیا میں مجھے جو کچھ بھی ملے گا وہ تیرے ہی حکم سے ملے گا، مجھے میرے گھر میں، میرے چولہے میں دولت بخش دے!"

اس کے بعد وہ اٹھا اور حسبِ معمول کھیت پر محنت مزدوری کرنے چلا گیا۔ ایک دن وہ کھیت میں کام کر رہا تھا کہ ایک جھاڑی میں اس کے کپڑے الجھ گئے اور کانٹوں میں پھنس کر پھٹ گئے۔ کسان نے سوچا کہ اس جھاڑی کو کھود کر اکھیڑ پھینکے تاکہ پھر کبھی اس کے کپڑے کانٹوں میں نہ الجھیں۔ وہ زمین کھود کر جڑ سے جھاڑی کو اکھیڑنے لگا۔ زمین کے اندر سے ایک مرتبان نظر آیا۔ کسان نے جلدی سے مرتبان کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو اس میں چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوا، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "پروردگار! میں نے تجھ سے دعا مانگی تھی کہ مجھے میرے چولہے میں دولت عطا کر مگر تو نے یہاں کھیتوں کے بیچوں بیچ دولت بخشی۔ میں اس کا کیا کروں! اگر یہ دولت تو مجھے بخشتا اور میری مراد پوری کرتا تو یہ دولت میرے گھر میں میرے چولہے سے نکلتی"۔ اس کے بعد کسان نے اس خزانے کو اسی جگہ زمین میں دفن کر دیا اور چپ چاپ گھر چلا آیا۔ اس نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے اس خزانے کا ذکر کیا۔ بیوی خاوند کی اس بیوقوفی پر بہت خفا ہوئی کہ "تجھے خدا نے دولت دی اور تو یونہی چھوڑ کر چلا آیا"۔ جب کسان سو گیا تو وہ گھر سے نکل کر باہر اپنی ہمسائی کے پاس گئی اور اس سے اپنے خاوند کی بیوقوفی کا سارا حال کہہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ "تم جا کر وہ خزانہ وہاں سے نکال لاؤ اور اس میں سے میرا حصہ مجھے دے دو"۔ ہمسائی نے سارا قصہ اپنے شوہر کو سنایا۔

ہمسایہ کسان یہ سن کر بہت خوش ہوا اور صبح ہوتے ہی سیدھا کھیت پر پہنچا۔ جب کسان نے خاردار جھاڑی کو ہٹا کر زمین کھودی تو وہاں وہی مٹی کا مرتبان رکھا ہوا

تھا لیکن جب اس نے مرتبان کا ڈھکنا کھول کر دیکھا تو اس میں زہریلے سانپ بھرے پائے یہ دیکھ کر اس شخص نے سوچا کہ اس عورت نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس طرح دھوکہ دے کر مجھے ان سانپوں سے ڈسوا دے۔ میں بھی اس کو ٹھیک کر دوں گا اور اس نے مرتبان کا ڈھکنا بند کر کے احتیاط سے مرتبان اٹھایا جونہی رات ہوئی چپکے سے کسان کے گھر میں گیا اور مرتبان کھول کر اس کے چولھے میں اُلٹ دیا۔

صبح سویرے جب کسان کی آنکھ کھُلی اور نماز کی تیاری کرنے لگا تو اس نے چولھے کی طرف جو دیکھا تو اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گیئں۔ اس نے قریب جا کر دیکھا، چولھا چاندی کے سکوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کا دل مارے خوشی کے اچھلنے لگا اور جھٹ اس نے اللہ پاک کے حضور میں شکرانے کے سجدے کیے اور کہنے لگا "میرے مالک تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں نے تجھ سے جہاں دولت مانگی تو نے وہیں عطا کی۔ اب یہ دولت میری ہے، تو نے میری مراد قبول کی، میں نے یہ دولت قبول کی۔"

---

(۱۱)

متحرک سُوئی

(یہ کہانی "ایک دفعہ ایک مُلّا" مؤلفہ "ایلس گیر کیلیے" مطبوعہ لانگمین گرین اینڈ کمپنی نیویارک سنہ ۱۹۵۴ء" سے لی گئی ہے ملّا نصیر الدین کی حیثیت ایرانی قصوں میں وہی ہے جو ترکی میں خواجہ نصر الدین کی ہے۔ ملّا جی اپنی دانائی اور سادہ لوحی دونوں باتوں کے لئے مشہور ہیں، ان کی سادگی میں اکثر حکمت اور ظرافت کے نکتے پوشیدہ ہوتے ہیں، جیسے اس کہانی میں ہے اور ملّا جی ہمیشہ کسی نہ کسی طرح صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بڑی شان سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ اصل کتاب کے ایک قصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آخر میں ملّا جی بڑھاپے کے سبب ضعیف ہونے جاتے ہیں۔ اس وقت اپنی طاقت جتانے کے لئے وہ بچپن اور جوانی کے زمانہ کے وہ واقعات سناتے ہیں جن میں ایک بھاری چٹان کا ذکر آتا ہے جسے وہ ہلا ڈالنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور برابر قوت آزمائی کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ مگر اس چٹان کو ذرا بھی نہ ہلا سکے، پھر بڑھاپے کے زمانے میں ملّا جی حاضرین کو بتاتے ہیں کہ وہ پچھلے دنوں اپنے وطن گئے تھے اور اس بھاری چٹان کو دیکھنے پہنچے، پھر بڑے جوش سے کہنے لگتے ہیں "میں تن کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے چٹان کو پکڑ لیا۔ گو میں بوڑھا ہوں . . . . . .

مگراب بھی تو میں اس چٹان کو جنبش نہ دے سکا۔" حوالہ کے لیے دیکھئے

ترکی کہانی "خواجہ نصر الدین کا وعظ"]

ایک دفعہ ایران میں ایک ملّاجی تھے ان کا نام تھا نصر الدین۔ ایک دفعہ وہ اصفہان کے عالیشان بازار میں ٹہل رہے تھے، وہ چلتے چلتے دائیں بائیں دوستوں کو خرید وفروخت کرتے دیکھتے جاتے اور انہیں جھک جھک کر سلام کرتے جاتے، جب کبھی وہ تبریز یا ہمدان اور کبھی ہندوستان یا مصر کے دُور و دراز سفر سے واپس آکر ان بازاروں میں نکلتے، تو ان کی چہل پہل دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ وہ چلتے چلتے ایک چھتہ بازار کے دوراہے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ چند آدمی سر جوڑے کھڑے ہیں۔ ایک ساربان کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ وہ اس کے بارے میں کوئی بحث کر رہے ہیں۔ اس ساربان کا نام تھا موسیٰ، حسب عادت ملّاجی کا دل فوراً چاہا کہ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کریں، کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ملّاجی کے سر کی پگڑی ہلی۔ اور لوگوں نے ان کو پہچان کر سلام کیا۔ ملّاجی نے بھی سلام کا جواب دیا اور ان میں سے ایک شخص نے کہا "ملّاجی، ہم لوگ یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ یہ کیا شے ہے، موسیٰ ساربان ریگستان سے اونٹ لے کر گزر رہا تھا کہ اس کی نظر اس پر پڑی" اور اس کے بعد موسیٰ بولا "میں جھٹ اونٹ پر سے اُترا اور اسے اٹھالیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہے کیا؟ میں نے سوچا کہ بازار میں کچھ سمجھ دار لوگ مل جائیں گے جو مجھے بتائیں گے یہ کیا شے ہے مگر کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا" مصطفےٰ نے کہا "ملّاجی آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ بھلا پہچانئے تو، یہ کیا چیز ہے؟"

ملّا نصر الدین نے گھور کر دیکھا۔ موسیٰ کے جھلسے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی پر دھات اور شیشہ کی ایک چھوٹی ڈبیا رکھی تھی۔ اس ڈبیا کے اندر کچھ حروف بنے تھے اور ایک ننھی

سی سوئی تھی، جب ڈبیا کو حرکت ہوئی تو وہ سوئی ہلنے لگی، لیکن پھر رک گئی اور ایک سمت پر قائم ہو گئی۔ ملاجی نے اس ڈبیا کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ادھر اُدھر ہلا کر دیکھنے لگے۔ سوئی متحرک ہوئی اور جب قائم ہوئی تو اس کا سرا شمال کی جانب ہی تھا۔ ملاجی نے حسبِ معمول اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، وہ بہت زیادہ سوچ بچار کے وقت یونہی کیا کرتے تھے۔ پھر وہ ڈبیا موسیٰ کے ہاتھ میں دے دی۔

ساربان نے پوچھا "کیا ہے یہ؟" اور جواب کی اُمید میں انہیں تکنے لگا، سب لوگوں کو یقین تھا کہ فاضل ملا کی زبان سے عقل و دانش کی بات سنیں گے، وہ تمام اس عجیب و غریب گھڑی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور اس کی اس حرکت سے دنگ تھے کہ اس کا سرا ہر وقت ہر حالت میں شمال کی جانب رہتا ہے۔ ملاجی نے پھر اپنی ڈاڑھی کو سہلایا۔ مگر زبان سے کچھ نہ بولے، اس کے بعد انہوں نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک دم ہنسنے لگے۔ لوگ حیران پریشان کھڑے تھے کہ یہ کیا بات ہے اور ملاجی برابر اسی طرح روتے ہنستے رہے، کبھی ہنستے، کبھی روتے۔ آخر لوگ تنگ آ کر پوچھنے لگے "ملاجی آپ روتے کیوں ہیں؟" کچھ لوگوں نے پوچھا "آپ ہنستے کیوں ہیں؟" مصطفےٰ نے کہا "ہم نے کسی کو اس طرح روتے ہنستے نہیں دیکھا، کوئی ملا بھی ایک ساتھ یوں کبھی ہنستا روتا نہیں ہے۔" ملاجی نے کہا "میں ابھی تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ میں کیوں رونا ہوں، اور کیوں ہنستا ہوں۔"

اتنی دیر میں سارے بازار کے چلنے پھرنے والے لڑکے، جوان، بوڑھے جمع ہو کر ملاجی کے چاروں طرف اکٹھے ہو گئے اور سارا مجمع یہ سننے کے لئے بے چین تھا کہ دیکھیں۔ ملاجی کی زبان سے کون سی حکمت کی بات نکلتی ہے۔

جو لوگ ملاجی کو نہیں جانتے تھے، واقف لوگوں نے ان کو بتایا، کہ وہ کون

ہیں۔ عورتیں اپنے برقعوں میں منہ چھپائے اس جگہ آکر کھڑی ہو گئیں۔ آخر ملّا جی نے کہنا شروع کیا "میں رو رہا اس لئے ہوں کہ تم لوگوں میں سے ایک بھی اس لائق نہیں جو پہچان سکے کہ یہ ننھا سا گول بکس اور اس میں یہ متحرک سوئی کیا ہے۔ تم سب کتنے بیوقوف ہو مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کیا تم کو اب بھی تعجّب ہے کہ میں کیوں رو رہا ہوں؟" اور یہ کہہ کر ملّا جی نے ایک ایک کی طرف نظر ڈالی۔ سب لوگ اپنی لاعلمی پر شرما کر گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ لڑکے تک اپنی جہالت پہ شرمندہ ہو کر منہ چھپا رہے تھے البتہ عورتیں اپنے نقابوں میں منہ ڈھانپے یہ سوچ کر خوش تھیں کہ ان کا کام تو اپنے گھر بار کی دیکھ بھال اور بچوں کو پالنا پوسنا ہے، انہیں کسی چیز کے جاننے بوجھنے کی کیا پڑی ہے، ان کو اس بات پر ذرا بھی تعجّب نہ تھا کہ فاضل ملّا کو اس بات پر شرم آرہی ہے کہ اتنے بڑے شہر اصفہان میں لوگ ایسے جاہل اور ناسمجھ ہیں۔

مصطفیٰ جو تمام لوگوں کے مقابلہ میں ملّا جی کو زیادہ جانتا تھا۔ اس نے ہمت کر کے بات بدل دی اور بولا "ملّا جی، یہ تو آپ نے ہمیں اپنے رونے کی وجہ بتائی ہے۔ اب یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ ہنستے کیوں ہیں؟"

اس پہ ملّا جی ایک بار پھر زور زور سے ہنسے اور بولے "میں ہنستا اس لئے ہوں کہ ——— مجھے خود بھی تو نہیں معلوم کہ یہ کیا شے ہے!"

---

(۱۲)

بغداد کا خلیفہ

(عراق کی یہ کہانی "مے میکینز اور شارلٹ لیٹورٗ" کی کتاب "ہلال کی کہانیاں" سے لی گئی ہے، یہ کتاب نیویارک کی رائن ہارٹ اینڈ کمپنی نے ۱۹۳۰ء میں شائع کی، یہ کہانی بغداد کی تاریخ کے اس شاندار زمانے سے تعلق رکھتی ہے جسے بغداد کا الف لیلوی دور کہا جاتا ہے اور جس کا خاتمہ تیرھویں صدی میں ہوا تھا)

کسی زمانے میں بغداد پر ایک خلیفہ حکومت کرتا تھا، وہ بڑا دیندار اور نیک حاکم تھا، قرآن مجید کا حافظ بھی تھا، وہ اپنی رعایا کی حالت سے اتنا باخبر رہتا کہ دربار میں خود سب کو خبریں سناتا کہ کل شہر کے بڑے بازار میں لوگ کیا کچھ کر رہے تھے: اسی وجہ سے لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ خلیفہ کی بیس آنکھیں اور تیس کان ہیں۔

خلیفہ ہر روز صبح کے وقت دربار آراستہ کرتا اور لوگوں کی درخواستیں سنتا۔ مگر دوپہر کے وقت وہ کسی سے نہ ملتا تھا۔ مشہور تو یہ تھا کہ خلیفہ دوپہر کو آرام کرتا ہے مگر اصل میں وہ اس وقت بھیس بدل کر اپنے محل کے ایک چور دروازے سے شہر میں گھومنے کے لئے نکل جاتا۔ خلیفہ کا وزیر علی بن منظر بھی اس کے ساتھ ہوتا۔

ایک دن خلیفہ اور اس کا وزیر تاجروں کا بھیس بدل کر شہر کی گشت کے لئے

نکلے، ابھی وہ شہر میں پہنچے بھی نہ تھے کہ انہیں راستے میں ایک بوڑھا ملا، بوڑھے نے خلیفہ کو بڑے غور سے دیکھا اور اس کے نزدیک آیا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک بڑی خوب صورت سنہری ڈبیا نکالی جس پر ہیرے جڑے ہوئے تھے اور خلیفہ کو دکھائی۔ خلیفہ کو ڈبیا بہت پسند آئی اور اس نے بوڑھے سے پوچھا "یہ کیا ہے بابا؟"

بوڑھے نے کہا "نسوار کی ڈبیا ہے حضور، بیچنے کو لایا ہوں۔"

خلیفہ نے پوچھا "کتنے میں بیچو گے؟"

"ایک اشرفی میں"۔ بوڑھے نے کہا۔

خلیفہ نے اسے ایک کی بجائے دو اشرفیاں دیں اور ڈبیا اس سے لے لی وہاں سے خلیفہ اور وزیر آگے بڑھے اور ایک جھیل کے پاس پہنچے۔ خلیفہ چلتے چلتے تھک گیا تھا اس لئے وہ آرام کرنے کو جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر خلیفہ نے جیب سے ڈبیا نکالی اور وزیر سے کہا "دیکھیں اس میں نسوار ہے بھی یا نہیں۔"

خلیفہ نے ڈبیا کھولی تو اندر سے ایک باریک کاغذ نکلا۔ کاغذ کھولا تو اس پر لکھا تھا۔

"نسوار کی ایک چٹکی تمہیں پرندہ بنا دے گی،

اور جب تم کہو گے "سلادیر" تو پھر آدمی بن جاؤ گے"

خلیفہ نے یہ پڑھ کر وزیر کو سنایا تو وہ ہنسنے لگا اور خلیفہ سے کہا "حضور یہ تو جادو کی ڈبیا ہے، نسوار سونگھ کر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

خلیفہ نے کہا "اس میں جو لفظ لکھا ہے، اس کے کہنے سے ہم پھر آدمی بن جائیں گے۔ اس پر بھی تمہیں یقین ہے؟"

وزیر نے جواب دیا "کیوں نہیں، اگر یہ نسوار ہمیں پرندہ بنا سکتی ہے تو یہ لفظ ہمیں آدمی بھی بنا سکتا ہے۔"

خلیفہ نے بھی سوچا کہ اگر ہم سچ مچ پرندے بن سکے تو مزے سے اُڑ کر سارے شہر کی سیر کر سکیں گے، یہ سوچ کر اس نے ڈبیا سے نسوار کی ایک چٹکی نکالی اور ڈبیا وزیر کو دی، وزیر نے بھی ایک چٹکی نسوار کی لی، دونوں نے نسوار سونگھی، نسوار کا سونگھنا تھا کہ خلیفہ اور وزیر بگلے بن گئے۔ خلیفہ نے بات کرنے کی کوشش کی تو "کوں کوں" کی آواز نکلی، وزیر نے بھی کچھ کہنا چاہا۔ مگر "کوں کوں" ہی کہہ سکا۔

اب خلیفہ اور وزیر دونوں پرندوں کی بولی بولنے اور سمجھنے لگے تھے۔ خلیفہ نے بگلے کی بولی میں وزیر سے کہا "چلو اس جھیل سے پرے اُڑیں۔"

وزیر نے بھی اسی بولی میں کہا "ضرور چلئے۔"

اور دونوں مل کر اڑنے لگے پھر اڑتے اڑتے انہوں نے سارے شہر کا بھی چکر لگایا اور شہر کی سیر کی۔ خلیفہ نے اپنے محل میں نوکروں کو چلتے پھرتے اور کام کرتے دیکھا اور سوچنے لگا کہ "ایک اڑنے والا بگلا مجھ سے زیادہ شہر کی حالت دیکھ سکتا ہے۔"

دونوں کو اڑتے اڑتے شام ہو گئی تو وزیر نے خلیفہ سے کہا "حضور رات ہو رہی ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے، ورنہ لوگ پریشان ہوں گے۔"

خلیفہ کو اڑنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا اور وہ ابھی سے واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر وزیر کی بات سن کر وہ بھی تیار ہو گیا اور دونوں اُڑتے اُڑتے اسی جھیل کے کنارے پہنچ کر زمین پر اُتر پڑے، خلیفہ نے نسوار کی ڈبیا وہیں ایک پودے میں چھپا دی تھی وہاں سے اسے نکال کر اس نے وہ کاغذ پھر سے پڑھا اور زور سے کہا "سلادیر" یہ لفظ کہہ کر وزیر کی طرف دیکھا کہ وہ پھر سے آدمی بنا ہے یا نہیں۔ مگر علی بن منظر کی بجائے اب بھی ایک بگلا وہاں کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر خلیفہ بہت گھبرایا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا۔ "سلادیر، سلادیر" مگر کچھ بھی نہ ہوا، خلیفہ اور وزیر دونوں بگلے ہی رہے، وزیر نے

بھی چلا چلا کر وہ لفظ دُہرایا، مگر کوئی اثر نہ ہُوا، اب تو دونوں بہت گھبرائے، گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں دونوں اڑنے لگے اور بڑی دیر تک اڑتے رہے جب بالکل تھک گئے تو پھر نیچے اترے۔ خلیفہ نے غمگین آواز میں کہا۔

"علی بن منظر! معلوم ہوتا ہے، کسی نے ہمارے ساتھ دشمنی سے ایسا کیا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟"

وزیر نے کہا "میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا حضور! اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اسی طرح رہیں اور وہ لفظ معلوم کرنے کی کوشش کریں جس کے اثر سے ہم پھر آدمی بن جائیں۔"

دونوں کو بھوک نے ستایا تو انھوں نے جھیل میں سے مچھلیاں پکڑ کر کھائیں اور وہیں سو گئے، صبح ہوتے ہی دونوں وہاں سے اُڑے اور شہر میں گھومنے لگے کہ دیکھیں لوگ ان کے غائب ہو جانے پر کیا باتیں کر رہے ہیں، اُڑتے اُڑتے دونوں محل پہنچے، اور ایک دیوار پر بیٹھ گئے، محل میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سارے نوکر خلیفہ اور وزیر کو ڈھونڈنے میں لگے تھے، ایک غلام نے محل کی دیوار پر بگلوں کو دیکھا تو رو کر کہنے لگا

"افسوس پرندے بھی ہمارے آقا کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

خلیفہ کو یہ دیکھ کر اتنا اطمینان تو ہُوا کہ سب اس کے غائب ہو جانے سے غمگین ہیں۔ دوسرے دن صبح کے وقت شہر کے سرداروں نے بازار میں یہ اعلان کر دیا کہ خلیفہ اور وزیر غائب ہو گئے ہیں اور کسی کو ان کا پتا نہیں، یہ سُن کر لوگ غم کے مارے رونے اور چلانے لگے، خلیفہ اور وزیر اُڑ کر پھر اسی جھیل پر پہنچے اور مچھلیاں کھا کر سو رہے۔

اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے، خلیفہ اور وزیر روز شہر پر سے اڑتے اور حسرت سے لوگوں کو دیکھتے رہتے، ایک دن وہ ایک بڑی سڑک کے اوپر اُڑ رہے تھے جو ایک دوسرے ملک کو جاتی تھی، اس سڑک پر انہیں ایک بڑا جلوس نظر آیا، جلوس میں

بہت سے اونٹ اور گھوڑے تھے جن پر لوگ شاندار وردیاں پہنے بیٹھے تھے، سواروں کے ساتھ ان کے نوکر بھی چل رہے تھے، یہ دیکھ کر خلیفہ کو کچھ شک ہوا اور وہ ذرا نیچے ہو کر اڑنے لگا، اس نے دیکھا کہ جلوس کے آگے آگے ایک نوجوان شاہی لباس پہنے گھوڑے پر سوار چلا جا رہا ہے، خلیفہ یہ دیکھ کر وزیر کے قریب پہنچا اور اس سے کہا۔

"علی بن منظر! یہ نوجوان قادر کا بیٹا ہے جو ہمارا دشمن ہے، یہ بغداد جا رہا ہے اس کا مطلب کچھ غیر ہی ہے۔"

دونوں جلوس کے ساتھ ساتھ اڑنے لگے، اور جب جلوس محل کے دروازے میں داخل ہو گیا تو دونوں غم اور غصے سے اپنے پر پھڑپھڑانے لگے، خلیفہ نے دیکھا کہ اس کے امیر اور درباری محل کے اندر سے نکل کر اس نوجوان کی تعظیم کر رہے ہیں، اس نے بڑے غرور سے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ان امیروں اور درباریوں سے کہا۔

"میں قادر خان کا بیٹا ہوں جو ہمسایہ ملک کا بادشاہ ہے میرے آبا کو معلوم ہوا تھا کہ آپ کا خلیفہ اور بغداد کا حاکم مر گیا ہے اور اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے، اب میں یہاں رہوں گا اور حکومت کروں گا۔"

خلیفہ کے امیروں اور درباریوں نے اسے جھک کر سلام کئے اور شہر کے لوگوں نے جو جلوس کے ساتھ ساتھ آئے تھے، چلانا شروع کیا "نئے خلیفہ کی عمر دراز ہو۔"

وزیر نے یہ دیکھ کر خلیفہ سے کہا "یہاں سے چلئے، اب یہاں ٹھہرنا بے کار ہے ہمارا شہر تو اب برباد ہو جائے گا کیونکہ قادر خان کا بیٹا بڑا ظالم آدمی ہے، ہم کسی جنگل میں چلے جائیں گے اور وہاں خاموشی سے زندگی گزار دیں گے۔"

دونوں وہاں سے چل دیے اور ایک گھنے جنگل میں پہنچے، وہاں ایک چشمے کے

کنارے دونوں رہنے لگے، چشمے میں سے مچھلیاں پکڑ کر کھاتے اور چشمے کے کنارے سو رہتے، اب انہوں نے بغداد یا بغداد کے نئے خلیفہ کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے، ایک دن ایک وزیر ایک مینڈک کا پیچھا کرتے ہوئے جنگل میں دور تک نکل گیا۔ وہاں جنگل میں بالکل اندھیرا تھا، خلیفہ اور وزیر اب تک اس طرف نہیں گئے تھے۔ وزیر بھی اس جگہ کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ نزدیک سے ٹھک۔ ٹھک کی بڑی تیز آواز آئی، وزیر آواز سن کر پہلے تو ڈر گیا، کیونکہ اندھیرے کی وجہ سے کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ پھر ہمت کر کے آواز کی سمت بڑھا۔ وہاں اسے ایک "کھٹ بڑھئی" نظر آیا جو ایک درخت پر بیٹھا چونچیں مار رہا تھا۔ علی بن منظر نے غور سے اس پرندے کی طرف دیکھا "کھٹ بڑھئی" برابر درخت کی چھال پر چونچیں مار رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، وزیر یہ دیکھ کر واپس ہوا اور خلیفہ کو جا کر یہ بات سنائی۔ خلیفہ اسے ساتھ لے کر اڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ خلیفہ بھی کھٹ بڑھئی کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور اس سے پوچھا "اے کھٹ بڑھئی! کیا تم ایک بگلے کی بولی سمجھ سکتے ہو؟"

کھٹ بڑھئی نے خلیفہ اور وزیر کی طرف دیکھا اور پوچھا "تم کون ہو؟"

خلیفہ نے کہا "تو تم سمجھ سکتے ہو ہماری بولی۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے، اب یہ بتاؤ کہ تم روتے کیوں ہو؟"

کھٹ بڑھئی نے کہا "مجھے تو رونا ہی چاہیئے، تم سچ مچ کے پرندے ہو تمہیں ضرور یہ زندگی پسند ہو گی۔ مگر مجھے تو پرندہ بنا دیا گیا ہے، میں روؤں نہیں تو اور کیا کروں!"

خلیفہ یہ سن کر حیران ہوا اور کہنے لگا "کیا بات ہے ہمیں بھی بتاؤ۔"

کھٹ بڑھئی نے کہا "مجھے قادر خان نے جادو سے کھٹ بڑھئی بنا دیا ہے، میں

پہلے ایک شہزادی تھی۔

خلیفہ نے کہا "اچھا تو قادر خان جادوگر ہے، اب یہ بتاؤ کہ ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کھٹ بڑھئی نے کہا "میں نے قادر خان کے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے اُس نے مجھے کھٹ بڑھئی بنا دیا، جب تک کوئی آدمی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش نہ کرے گا، میں کھٹ بڑھئی رہوں گی"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور پھر رونے لگی، اور کہا "صرف یہی مصیبت نہیں، مجھے ہر رات اُن تین جادوگروں کی بیہودہ باتیں بھی سننا پڑتی ہیں، جو اس جنگل میں قادر خان سے ملنے آتے ہیں"۔

خلیفہ نے کہا "کہاں آتے ہیں وہ؟"

کھٹ بڑھئی نے جواب دیا "یہاں سے سیدھے جاؤ تو ایک کھلی جگہ آئے گی، جہاں گھاس اُگی ہوئی ہے، روزانہ رات کو وہ سب وہیں جمع ہوتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ درخت کی چھال پر کھٹ کھٹ کرنے لگی۔

خلیفہ نے وزیر کو اشارہ کیا اور دونوں وہاں سے اڑ کر اس جگہ پہنچ گئے، دونوں نیچے اترے اور جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے، دن بھر وہیں بیٹھے رہے، رات ہوئی تو تین آدمی دبے پاؤں وہاں آئے اور گھاس پر بیٹھ گئے، ان کے بعد دو اور آدمی کالے لبادے اوڑھے ہوئے وہاں آئے، چاند کی روشنی میں خلیفہ نے انہیں دیکھ لیا، ان میں ایک تو قادر خاں تھا اور ایک اس کا چھوٹا بیٹا جو اب بغداد کا خلیفہ بنا بیٹھا تھا۔

قادر خان نے اپنے بیٹے سے پوچھا "بیٹا بغداد والے تمہارے ساتھ کس طرح پیش آئے؟"

بیٹے نے کہا "وہ کیا کر سکتے تھے۔ میں ان کا حاکم ہوں، لوگ اب پہلے کی طرح خوش نظر نہیں آتے مگر میرا حکم برابر بجا لاتے ہیں مگر آپ نے خلیفہ کو کس طرح ختم کیا؟"

قادر خاں نے مسکرا کر کہا "اب تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے ایک بوڑھے کا بھیس بدل کر خلیفہ اور اس کے وزیر کے ہاتھوں نسوار کی ایک ڈبیا بیچی، وہ نسوار جادو کی تھی میں نے ڈبیا کے اندر ایک کاغذ رکھ دیا تھا جس پر لکھا تھا۔

"نسوار کی ایک چٹکی تمہیں پرندہ بنا دے گی اور
جب تم کہو گے "سلادیر" تو آدمی بن جاؤ گے"

دونوں نے اس پر بھروسا کر لیا اور نسوار سونگھ لی۔ مگر میں نے اصل لفظ نہیں لکھا تھا، اصل لفظ تو "زلادیر" ہے، میں نے سلادیر لکھا تھا اب انہیں اصل لفظ کا پتا ہی نہیں چل سکتا۔"

یہ سُن کر قادر خان کا بیٹا ہنسنے لگا، خلیفہ اور اس کے وزیر کے لئے اب وہاں زیادہ ٹھہرنا مشکل ہو گیا، وہ وہاں سے چھپتے چھپاتے نکلے اور اڑ کر اس جگہ پہنچے جہاں کھٹ بڑھئی رہتا تھا، وہاں پہنچ کر دونوں زمین پر اترے اور زور زور سے کہا۔ زلادیر، زلادیر" یہ کہتے ہی دونوں آدمی بن گئے، کھٹ بڑھئی بڑی حیرانی سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، اب خلیفہ اس کی طرف بڑھا اور اس سے کہا "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

خلیفہ کا یہ کہنا تھا کہ کھٹ بڑھئی کی جگہ ایک نہایت حسین شہزادی ان کے سامنے کھڑی تھی، شہزادی نے خلیفہ سے کہا "اے خلیفہ! تم نے مجھے دوبارہ زندگی دی ہے اب میں تمہاری لونڈی ہوں۔"

خلیفہ اور وزیر شہزادی کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف چلے، شہر کے لوگوں نے خلیفہ کو زندہ سلامت دیکھا تو ڈر گئے اور زمین پر سجدے میں گر پڑے، خلیفہ سیدھا محل

کے دروازے پر پہنچا۔ محل کے دروازے پر پہنچ کر وزیر نے نوکروں کو آواز دی اور کہا "دروازہ کھولو! تمہارے خلیفہ آگئے ہیں۔"

بغداد کے لوگ قادر خاں کے غرور اور ظلم سے تنگ آ چکے تھے۔ خلیفہ کے واپس آنے پر وہ بہت خوش ہوئے، محل کے نوکروں نے فوراً دروازے کھول دیئے، اور خلیفہ کے گرد جمع ہو گئے۔

قادر خاں کے بیٹے کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی مشکیں باندھ کر اس کے باپ کے پاس بھیج دیا گیا۔

خلیفہ نے شہزادی کے ساتھ شادی کر لی۔ بڑی دھوم دھام کا جشن منایا گیا، اور خلیفہ پہلے کی طرح چین سے زندگی گزارنے لگا۔ مگر زندگی بھر اس نے مچھلی نہیں کھائی اور حکم دیا کہ محل میں ایک سال تک مچھلی نہ پکائی جائے۔"

۱۳

انہونی

[یہ کہانی دو مختلف ملتے جلتے قصوں کی بنیاد پر ہے' ان میں سے ایک قصہ تو غیر مطبوعہ ہے اور دوسرے کا عنوان ہے "داستان جو سراسر جھوٹ ہے" یہ حبیب خطیبہ کی کتاب "دوسری الف لیلیٰ" سے ماخوذ ہے جسے چارلس اسکربنرز اینڈ سنز نیویارک نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔

خطیبہ کے بیان کئے ہوئے قصے میں داستان گو خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کا ظریف شاعر ابونواس ہے، اس کی ایک کہانی اس مجموعہ میں سعودی عرب کی منتخب کہانی "ابونواس کے کارنامے" کے نام سے موجود ہے، مشرق وسطیٰ اور شمالی اور مشرقی افریقہ کے ان علاقوں میں جہاں تہذیب کا اثر ہے بلکہ انڈونیشیا تک کے دور دراز مقام میں 'ابونواس' کے قصے پھیلے ہوئے ہیں۔]

ایک دفعہ خلیفہ کے حضور میں عرض کیا گیا کہ شہر میں ایک بڑا لائق داستان گو ہے۔ یہ شخص قصے کہانیوں کا ایسا تار باندھتا ہے کہ کبھی ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شخص صبح سے لے کر شام تک لگاتار داستانیں سناتا چلا جاتا ہے، اور شام سے رات گئے تک برابر ان سنی کہانیاں کہتا رہتا ہے، کہتے ہیں وہ ایک بار جو کہانی سنائے

اسے دوبارہ کبھی نہیں دہراتا۔ خلیفہ نے درباریوں کو اس داستان گو کی تلاش میں روانہ کر دیا، جب وہ اس شخص کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے، تو خلیفہ نے اس سے کہا "ہم نے سُنا ہے کہ تم اس ملک کے سب سے بڑے داستان گو ہو، کیا وجہ ہے کہ ہم نے اس سے پہلے تمہارا نام کبھی نہیں سُنا؟"

اس شخص نے جواب دیا "مجھے اپنی بڑائی کا کوئی دعویٰ نہیں، میں قہوہ خانوں میں اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لئے اپنی پسندیدہ کہانیاں سنایا کرتا ہوں۔"

خلیفہ نے کہا "بس رہنے دو۔ اس جھوٹی کسرِ نفسی سے کوئی فائدہ نہیں لوگ تو کہتے ہیں تم طرح طرح کے قصّے کہانیاں سنایا کرتے ہو اور اس وقت تک کہے جاتے ہو جب تک سننے والے انہیں ختم کرنے کے لئے چیخ پکار نہ کریں، تم پہلے کچھ کھا پی لو، اس کے بعد ہم تم سے کوئی کہانی سنیں گے۔"

بعد ازاں درباریوں نے داستان گو کو کھانا کھلایا اور خلیفہ کے حضور میں پھر پیش کر دیا۔

خلیفہ نے کہا "اگر ہم تم سے کوئی ایسی کہانی سننا چاہیں جو صبح تک ختم ہو اور جس کی ہر بات سچی ہو تو غالباً تم سنا سکو گے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں، تمہاری لیاقت کی یہ صحیح پرکھ نہیں کیونکہ ایسی کہانیاں بہت سے اور قصہ گو بھی سنا سکتے ہیں، ہم تو تم سے ایسی کہانی سننا چاہتے ہیں جو بہت مختصر ہو اور اس کی ہر بات جھوٹی ہو، اگر ہم نے اندازہ کیا کہ اس کہانی میں کوئی لفظ بھی صحیح اور سچا ہے تو ہم تم کو اپنا غلام بنالیں گے، ہاں اب تم کہانی شروع کر سکتے ہو۔"

داستان گو نے خلیفہ کی یہ شرط سنی تو پہلے وہ کچھ ہچکچایا اور گھبرایا، کیونکہ تھوڑی دیر تک لگاتار کوئی بات بھی ایسی کہتے رہنا بہت مشکل ہے، جس میں کہیں بھی سچائی اور اصلیت نہ آنے پائے، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ اس نے کہانی سنانا شروع کی۔

"یا خلیفۂ اعظم! میں اپنے باپ کا سب سے بڑا لڑکا ہوں۔ میں آٹھ سال کا تھا جب وہ پیدا ہوا۔ میری دادی نے اس کو میری گود میں ڈال دیا اور مجھے کہا کہ اسے رونے نہ دوں۔ مگر وہ رونے لگا۔ میں نے ہزار جتن کیے لیکن وہ چپ نہ ہوا۔ آخر اس نے بازار لے چلنے کی ضد کی اور میں اس کو لے گیا۔ وہاں جا کر وہ کچھ بحال ہوا کیونکہ اس نے کچھ لوگوں سے قرآن مجید کے چند اہم مسئلوں پر بحث مباحثہ شروع کر دیا۔ ہم بازار ہی میں تھے کہ اس نے مجھ سے ایک تازہ انڈا خریدنے کی فرمائش کی۔ انڈا خرید کر اس کو دیا ہی تھا کہ اس انڈے میں سے ایک چوزہ نکل پڑا۔ چوزہ تھا بہت بڑا اور ہم دونوں چلتے چلتے بہت تھک گئے تھے۔ ہم اس پر سوار ہو کر گھر چل دیئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ چوزہ اتنا بڑا ہو گیا جیسے اونٹ۔ تو مجھے اپنے باپ کو اپنے دادا کے حوالے کرنا پڑا۔ چونکہ میرا باپ میرا بھائی بھی تو تھا اور میرا باپ بھی"

خلیفہ کو اس بے سروپا جھوٹ پر سخت غصہ آنے لگا۔ داستان گو کہانی سناتا رہا اس نے آگے بیان کیا:۔

"اس چوزے کا ہاضمہ غضب کا تھا۔ وہ اتنا کھاتا، اتنا کھاتا کہ ہم سب بھوکے رہنے لگے۔ آخر ہم نے اسے کام پر لگایا۔ چونکہ چوزہ میرے باپ کی ملکیت تھا۔ اس لئے وہ روزانہ صبح کے وقت اس کو جنگل لے جاتا اور اس پر جلانے کی لکڑیاں لاد کر گھر لے آتا یہاں تک کہ ہمارے مکان کا صحن لکڑیوں سے بھر گیا۔ اس دوران میں چوزے کی پیٹھ لکڑیوں سے چھل کر زخمی ہو گئی اور چوزہ بیچارا بیمار پڑ گیا۔ میرے دادا کو اس کی بڑی فکر ہوئی۔ آخر انہوں نے اپنی پردادی سے اس کے علاج کی ترکیب پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ اخروٹ کے بیج کی لیپڑی بنا کر چوزے کی پیٹھ پر باندھو۔ انہوں نے وہ لیپڑی باندھی اور دوسرے دن جب وہ صبح سویرے اٹھے تو چوزہ ہٹا کٹا تھا۔ مگر اس کی پیٹھ پر اخروٹ کا ایک

درخت اُگ آیا تھا تین دن کے بعد وہ درخت بہت بڑا ہو گیا اور جہاں کہیں چوزہ جاتا۔ وہ درخت جھولتا ہوا اس کے ساتھ ہوتا۔ ہفتہ بھر کے اندر اس درخت کی شاخوں میں اخروٹ کے ڈھیر لٹکنے لگے۔ یہ حال تھا کہ ایک درجن آدمی ان اخروٹوں کو توڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے۔ جب کہیں اکٹھے کر پائے اور انہیں بھی سنیچر سے لے کر جمعرات تک چھ دن اس کام میں لگے۔ اس کی شاخیں بڑھتے بڑھتے اتنی لمبی ہوگئیں کہ اخروٹ توڑنے والے جو صبح کو درخت پر چڑھے تھے وہ اترنے لگے تو ان کے نیچے پہنچنے تک دن چھپ چکا تھا اور شام ہوگئی تھی۔ ماغلیفہ نے بڑے غصہ سے اپنا سر ہلایا۔ داستان گو کہتا رہا۔

"جب اخروٹ چننے کا کام ختم ہوا۔ تو میں نے یہ دیکھنے کے لئے درخت کے چاروں طرف چکر لگایا کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گئے اور اس کام میں مجھے سارا دن لگانا پڑا۔ میں فارغ ہو کر جانے لگا تھا کہ میں نے دیکھا وہ چوزہ درخت کی شاخوں میں بیٹھا ہے اور رات کے بسیرے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے زمین سے ایک ڈھیلا اٹھا کر اس کے پھینک مارا وہ ڈھیلا درخت کے اوپر چلا گیا اور پھر نیچے نہیں آیا۔ اس نے پھیلتے پھیلتے سارے درخت کی چوٹی کو گھیر لیا اور پھر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ وہاں چوٹی پر کوئی چالیس ایکڑ زمین کھیتی باڑی کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنے مویشی اس زمین پر چرنے کے لئے بھیج دیئے اور دوسری فصل تک کاشتکاری کے لئے کھیت تیار ہو گئے۔ میرے دادا نے اور میں نے اس زمین میں تل کے بیج بوئے۔ لیکن ایک مہینے کے بعد پتہ چلا کہ ایک دانہ بھی نہ اُگ سکا۔ میرے دادا نے اپنے ہمسایوں سے مشورہ کیا انہوں نے بتایا کہ آپ نے تل بو کر حماقت کی تھی۔ ایسی تازہ زمین میں خربوزے کے سوا اور کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی یعنی میرے باپ کو درخت کی چوٹی پر بھیجا۔ تاکہ ہم دونوں تل کے

تمام بیج جو وہاں بوئے تھے چن کر لے آئیں۔ ہم دونوں کوئی ایک گھنٹے میں سارے بیج لے کر آ گئے۔ ان بیجوں کا وزن ۲۰ گیلن کے قریب تھا لیکن جب ہم واپس آئے اور بیج کو گنا تو ایک بیج کم نکلا۔ ہمیں دوبارہ ایک بیج کی تلاش میں جانا پڑا اور چالیس ایکڑ زمین کا چپہ چپہ چھاننا پڑا۔ بیج کہیں نہ ملتا تھا۔ جب ہم مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے تو دیکھا کہ ننھی سی چیونٹی اس کو کھینچے ہوئے اپنی بہاڑی پر لے جا رہی ہے۔ میں نے بیج پکڑ لیا مگر چیونٹی نے اس کو نہیں چھوڑا۔ بڑی دیر تک چیونٹی کے اور میرے درمیان سخت کھینچا تانی ہوتی رہی۔ اور ہم دونوں میں سے ایک بھی نہ ہارا۔ آخر اسی دوران میں تل کے دانہ کے ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور اس ایک دانہ سے اتنا تیل نکلا کہ بہتے بہتے تیل کا دریا بن گیا۔ اور ہماری چالیس ایکڑ زمین کے کسان اس میں کشتیاں چلانے لگے۔"

خلیفہ جز بز ہونے لگا۔ داستان گو نے آگے کہنا شروع کیا۔

" خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جب میرے باپ میرے دادا اور میں خربوزے کے بیج بو رہے تھے تو بڑا ہولناک طوفان آ گیا۔ چونکہ اس چالیس ایکڑ بنجر زمین میں کہیں سایہ دار جگہ نہ تھی ہم بہت گھبرائے کہ کہاں جا کر سر چھپائیں۔ میں اور میرے دادا جلدی کود کر اپنے باپ کے دانت کے سوراخ میں گھس گئے۔ اور میرے باپ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر ایک موٹی تازی بھیڑ کو پکڑ لیا اور ہمارے ساتھ پناہ لی۔ کوئی تین کم پچاس روز وہ طوفان جاری رہا۔ اس دوران میں ہم سب فاقے مر جاتے اگر میرے باپ نے بھیڑ کو نہ پکڑ لیا ہوتا۔ آخر ہم نے ایک دن دانت میں سے جھانک کر دیکھا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مگر جب میں اور دادا جان دانت کی کھوہ میں سے نکلے تو دیکھتے کیا ہیں طوفان اور بارش سے وہ چالیس ایکڑ زمین ساری بہہ چکی ہے اور ہم سب ہوا میں معلق ہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ میرے باپ اپنے ساتھ ایک رسی لائے تھے۔ ہم نے اس رسی

کو کچھ کچھ کر زمین کی طرف نیچے اترنا شروع کیا، اور ایک ایک کر کے صحیح سلامت گھر پہنچ گئے۔"

خلیفہ نے یہ دیکھ کر کہ اب کہانی ختم ہونے کو ہے اس سے کہا "اے داستان گو!

تم نے بڑی شاندار سرگزشت سنائی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ آیا یہ سچی کہانی ہے یا بناوٹی ہے"

داستان گو نے جواب دیا "عالی جاہ! یہ شروع سے آخر تک سب کی سب سچی ہے"

خلیفہ نے کہا "اگر یہ سچی ہے تو تم میرے حکم کی تعمیل میں ناکام رہے۔ کیونکہ میں نے تم سے ایسی کہانی کو کہا تھا جس کا ایک لفظ بھی سچ نہ ہو"۔ اس شخص نے ہنس کر کہا "خلیفۂ اعظم میں نے آپ کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی ہے۔ اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ یہ کہانی سچی ہے وہ بھی آپ کے حکم کی بنا پر جھوٹ ثابت کرنے کے لئے کہا ہے۔"

خلیفہ ہنسا اور کہنے لگا "بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا سب کچھ صحیح پایا۔" پھر خلیفہ نے داستان گو کو سونے کی اشرفیوں سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔

۱۴

خواجہ نصرالدین کا وعظ

یہ کہانی "ترکی کی کہانیاں" سے لی گئی ہے۔ جسے ایلن رمزے اور فرانسس میکو لاخ سمکن مارشل ہملٹن کیرٹ، نے مرتب کر کے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔ اس قسم کا طنز و مزاح ترکی اور ان سب علاقوں کے قصے کہانیوں میں عام پایا جاتا ہے، جو اسلامی قصوں کے انداز سے متاثر ہیں (مثلاً اس کتاب کی دو کہانیاں "متحرک سوئی" اور بینٹ جارج کے اژدہے کی دم") شمالی افریقہ میں اس طرح کے واقعات کو ابونواس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دنیا کے دوسرے علاقوں، ریاستہائے متحدہ امریکہ وغیرہ میں انہیں افریقائی، امریکی عوامی کہانیاں کہتے ہیں۔

ایک دفعہ جمعہ کا دن تھا مسجد میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ خواجہ نصیرالدین منبر پر وعظ سنانے کھڑے ہوئے وعظ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ "اے بھائیو! اے سچے ایمان والو! میں تم سے پوچھتا ہوں، ذرا سچ بتاؤ، کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج میں تمہارے سامنے کیا بیان کرنے والا ہوں؟"

مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا "ہمیں کچھ نہیں معلوم آپ کیا بیان کریں گے، اور ہمیں

یہ معلوم بھی کیسے ہو سکتا ہے!"

خواجہ نے کہا "تو پھر ایسی بات بتانے کا کیا فائدہ جس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔" اور خواجہ جھٹ منبر سے اُتر کر مسجد سے روانہ ہو گئے۔ تمام حاضرین ایک دوسرے کا منہ تکتے حیران پریشان کھڑے رہ گئے۔

آئندہ جمعہ کو لوگ پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں جمع ہوئے۔ وہ سب بڑے ذوق شوق سے اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں آج خواجہ صاحب کیا فرماتے ہیں، پچھلے جمعہ کی باتیں سُن کر لوگوں پر خواجہ کا بڑا رعب جم گیا تھا۔ آخر اُس دن جب خواجہ سامنے آئے تو حاضرین پر سکوت چھا گیا، اور وہ بڑے غور سے ان کا وعظ سننے کو تیار ہو گئے۔ خواجہ منبر پر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "اے بھائیو! اے سچے ایمان والو! میں تم سے پوچھتا ہوں، ذرا سچ بتاؤ، تمہیں معلوم ہے، آج میں تمہارے سامنے کیا بیان کرنا چاہتا ہوں۔" مجمع یک زبان ہو کر اکدم چلایا "ہمیں معلوم ہے، خوب معلوم ہے کہ آپ کیا بیان کریں گے۔" معلوم ہوتا تھا، ان سب لوگوں نے پہلے سے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اگر خواجہ پچھلی بار کی طرح سوال کریں گے تو ہم یہ جواب دیں گے اور خواجہ صاحب کو وعظ سنانا پڑے گا، لیکن ان کا جواب سُن کر خواجہ نے کہا "یہ بات ہے تو پھر میں اپنا اور سب کا وقت فضول کیوں ضائع کروں۔ آپ کو معلوم ہی ہے، میں کیا کہنے والا ہوں۔" اور فوراً منبر سے اتر کر مسجد سے باہر چلے گئے۔

مجمع لاجواب ہو گیا، ان میں سے کچھ لوگ نماز پڑھنے مسجد میں ٹھہر گئے اور تھوڑی دیر بعد سب ایک ایک کر کے یا ٹولیوں میں خواجہ کی اس بات کا چرچا کرتے چلے گئے، سب حیران تھے کہ خواجہ نے ایک دن تو یہ کہہ کر وعظ نہیں سنایا کہ "ہم کو کچھ معلوم نہیں۔" اور آج جب ہم نے کہا کہ "ہمیں معلوم ہے" تو انہوں نے اور ہی بہانہ کر کے وعظ کو ٹال دیا۔"

آخر پھر جمعہ آیا۔ خواجہ نصر الدین پھر مسجد میں آئے۔ انہوں نے مجمع پر نظر ڈالی۔ لوگوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ خواجہ نے منبر پر کھڑے ہو کر پہلے کی طرح مجمع کو مخاطب کیا اور کہا "اے بھائیو! اے ایمان والو! میں تم سے پوچھتا ہوں۔ بتاؤ کیا تمہیں معلوم نہیں، میں تمہارے سامنے کیا بیان کرنا چاہتا ہوں"۔ مجمع آج پہلے سے زیادہ تیار تھا اور سب نے مشورہ کر کے جواب سوچ رکھے تھے، چنانچہ مجمع میں سے ایک ٹولی نے یک زبان ہو کر کہا۔ "ہم غریب جاہل لوگ ہیں۔ ہمیں کیا معلوم آپ کیا سنائیں گے۔"

اور پھر دوسری ٹولی نے کہا "ہمیں معلوم ہے، آپ کیا کہنے والے ہیں۔" خواجہ نے دونوں کے جواب سنے اور کہا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے بھائیو! آپ میں سے جنہیں میرے وعظ کا علم ہے وہ ان لوگوں کو جنہیں اس کا علم نہیں سب کچھ بتا دیں، میں آپ کا احسان مند ہوں کہ اس طرح میرا کام آسان ہو گیا اور مجھے کچھ بھی بیان کرنے کی ضرورت نہ رہی۔" اور اس کے بعد خواجہ چپ چاپ منبر سے اتر کر مسجد سے روانہ ہو گئے۔ اور سب لوگ دم بخود تکتے رہ گئے۔

۱۵

ابونواس کے کارنامے

(یہ کہانی "کتاب ابونواس کی زندگی اور کہاوت" سے لی گئی ہے۔ جسے ڈبلیو ایچ انگرامس نے مرتب کیا۔ اور رابرٹ لوئس، ماریشس میں ۱۹۳۲ء میں نجی طور پر شائع کی گئی۔ ابونواس (جسے عام طور پر "ابونواس" اور "ابونواس" دونوں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے) اپنی اصل زندگی میں خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں ایک شاعر تھا۔ اور چونکہ وہ ہارون رشید کے دربار کا ایک رکن تھا اس لئے خلیفہ اس کو بخوبی جانتا تھا۔ بے شمار مبالغہ آمیز قصے ابونواس کے نام سے مشہور ہو گئے جن کا اس کی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عراق، عرب، شمالی افریقہ کے علاقوں میں جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ ابونواس کی شخصیت عیار ہیرو کی مانی جاتی ہے لیبیا وغیرہ میں اس کے بارے میں بہت سے قصے کہانیاں مشہور چلی آتی ہیں۔ بہت سے ایسے قصے ہیں جن میں وہ بادشاہوں، سوداگروں اور کسانوں کو اپنی عیاری کا نشانہ بناتا نظر آتا ہے۔ بہت سے قصے بیہودہ ہیں۔ جن کا تعلق اصل میں اس کی ذات سے اتنا نہیں جتنا کہ اس کے نام سے، شہرت کی وجہ سے ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن میں ابونواس کی شخصیت اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق محض۔ وہ اپنے طور پر ظاہر

کر دی گئی ہے۔ جو واقعہ اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی مخصوص انداز کی چیستاں کہانیوں میں سے ایک ہے جو اس کی نسبت گھڑی گئی ہیں۔ گوشت کی خوشبو چرانے کا واقعہ اور روپیہ کی چھن چھن کی آواز کے ذریعہ اس کے تاوان کی ادائیگی جدید میکسیکو کے طرز کی چیز ہے جسے میکسیکو کے خصوصی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔)

جب دنیا بھر کے سب سے بڑے عیّار آدمی کا ذکر کیا جاتا ہے تو کوئی کسی کا نام لیتا ہے اور کوئی کسی کا۔ لیکن جن لوگوں کو اس بات کا صحیح علم ہے وہ ابو نُواس کا نام ہی لیتے ہیں۔ اُس کی زندگی ہنسی دل لگی اور ظرافت کے دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے جب کبھی وہ لوگوں کا مذاق اُڑانے یا کسی چالاک آدمی کو بیوقوف بنانے کا خیال کر لیتا تو ایک سیدھے سادے دیہاتی سے لے کر ایک بادشاہ تک کو نہ چھوڑتا۔

کہتے ہیں ایک دن ابو نُواس کا گدھا پیاسا تھا۔ اور اس کو برتن کی ضرورت تھی جس میں اُس کا گدھا پانی پی سکے۔ وہ اپنے ہمسائے کے پاس گیا اور اس سے برتن مانگنے لگا تاکہ گدھے کو پانی پلائے۔ اُس کے ہمسائے نے ابو نواس کو ایک تانبے کا برتن دیا۔ وہ اُس برتن کو گھر لے گیا۔ اور تین دن تک اپنے پاس رکھا۔ چوتھے دن اُس نے تانبے کا ایک اور چھوٹا برتن لے کر ہمسائے کے برتن کے اندر رکھ دیا اور دونوں برتن اُس کو دے آیا ہمسائے نے برتن لے کر جب دوسرے چھوٹے برتن کو دیکھا تو کہا "اس کے ساتھ جو چھوٹا برتن ہے یہ میرا نہیں ہے۔"

ابو نواس نے جواب دیا "میں چور تو ہوں نہیں۔ تمہاری چیز تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ میرے گھر میں تمہارا تانبے کا برتن رکھا ہوا تھا۔ وہاں اُس نے ایک برتن کا بچہ دے دیا۔ بڑا برتن اور اس کا بچہ دونوں تمہارے ہیں۔ اس لیے میں تم کو دینے آیا ہوں۔"

ہمسائے نے سوچا کہ ابو نواس کی بیوقوفی سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اُس نے

کہا" اچھا، اچھا تو پھر ٹھیک ہے! اگر یہ چھوٹا برتن میرے برتن کا بچہ ہے تو یقیناً میرا ہے۔ پروردگار! ابونواس کے گھر پہ رحمتیں نازل کرے جہاں برتن بچے دیا کرتے ہیں۔"

تین دن کے بعد ابونواس ہمسایہ کے گھر پھر گیا اور برتن مانگا۔ ہمسایہ نے خیال کیا کہ اُس کی قسمت پھر جاگے گی۔ اُس لیے اُس نے خوشی خوشی تانبے کا ایک برتن ابونواس کو دے دیا۔ اُس نے سوچا کہ اگر انسان کے برتن بچے دینے لگیں تو کیا کہنا ہے۔

ابونواس نے ہمسایہ کا شکریہ ادا کیا اور برتن لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ پھر کیا ہوا کہ اس بار اُس نے ہمسائے کا برتن واپس ہی نہیں کیا۔ آخر کئی دن کے بعد ہمسایہ ابونواس کے گھر پہنچا اور اپنا برتن مانگنے لگا۔ ابونواس نے غمگین صورت بنا کر جواب دیا" میں تمھیں بہت ہی بُری خبر سناتا ہوں۔ تمہارا برتن مر چکا ہے۔"

ہمسائے نے چیخ کر کہا: "کیا کہا؟"

ابونواس نے کہا" ہاں بھائی مجھے معلوم تھا کہ اس خبر سے تم کو بہت صدمہ ہوگا اور اسی لیے میں نے تم کو اسی وقت اس کی اطلاع نہیں دی تھی، جس روز یہ افسوس ناک واقعہ ہوا تھا۔"

ہمسایہ غصّہ میں آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا" ابونواس تم مجھے احمق بنا رہے ہو۔ بھلا تانبے کے برتن کب سے مرنے لگے؟"

ابونواس نے کہا" میاں تانبے کا برتن بچہ دیتا ہے یا نہیں؟"

ہمسایہ نے کہا" بے شک دیتا ہے" کیونکہ اسے تانبے کا وہ چھوٹا برتن یاد تھا جو ابونواس نے اُسے دیا تھا۔

ابونواس نے کہا" تو ظاہر ہے کہ جس کے بچہ پیدا ہو سکتا ہے وہ مر بھی سکتا ہے بڑے رنج کی بات ہے کہ تمہارا برتن اپنے گھر سے دور میرے پاس مر گیا۔ مگر مجبوری!"

جس کسی سے ہمسایے نے شکایت کی۔ ابونواس نے اُس کو برتن کے بچہ ہونے کا قصہ بھی سنا دیا اور اُس نے مان لیا کہ ابونواس سچ کہتا ہے۔ جس چیز کے بچہ ہو گا وہ مر بھی سکتی ہے۔

کچھ عرصہ بعد ابونواس کے پاس ایک شخص آیا اور اُس کا گدھا مانگنے لگا۔ ابونواس نے جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ میرا گدھا گھر نہیں ہے وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں اُس کا گدھا جو گھر کے اندر ہی ایک طرف کھڑا تھا زور زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا۔ وہ شخص گدھے کی آواز سن کر بھڑکا اور کہنے لگا کہ "تمہارا گدھا تو ابھی بول رہا تھا۔ تم کہتے ہو وہ باہر گیا ہوا ہے۔"

ابونواس نے جواب دیا "تم گدھا مانگنے آئے تھے یا اُس کا رینگنا۔ اگر تم اُس رینگ پر سوار ہونا چاہتے ہو تو لو یہ حاضر ہے۔ اس پہ چڑھ جاؤ اور سواری بڑھاؤ۔" یہ کہہ کر ابونواس نے خود ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ آدمی شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

ایک مرتبہ ابونواس نے دو منزلہ مکان بنایا اور اُسے بیچنے کا ارادہ کیا لیکن کسی شخص کو دو منزلہ مکان پسند نہ آیا۔ آخر ابونواس نے ایک رئیس کو اوپر کی منزل خریدنے پر آمادہ کر لیا۔ رئیس اُس مکان کے بالائی حصہ میں رہنے لگا۔ اس کے بعد ابونواس نے کوشش کی کہ رئیس کو نیچے کا مکان خریدنے کے لئے بھی تیار کرے۔ مگر رئیس انکار ہی کرتا رہا چنانچہ ایک روز ابونواس نے بہت سے مزدوروں کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ مکان کی ساری دیواریں گرا دیں۔ مزدوروں نے فوراً پھاوڑے چلانا شروع کر دیئے۔ جب رئیس کے کانوں میں کھٹ پٹ کی آوازیں گئیں تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگا اور ابونواس سے پوچھا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

ابونُواس نے جواب دیا "میں مکان کا نچلا حصّہ فروخت نہیں کر سکا اس لئے اسے گرا رہا ہوں۔ آپ اپنے مکان کے حصّے کی خبر گیری کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گر پڑے اور میرے مزدوروں کو کچل ڈالے۔"

یہ سُن کر رئیس چلا اُٹھا "ٹھہرو ٹھہرو! میں خرید لوں گا۔ تمہارا مکان میں خرید لوں گا۔" اور اُس نے مکان کا نچلا حصّہ خرید لیا تاکہ اوپر کی منزل گر نہ پڑے۔ اس کے بعد ابونُواس نے مزدوروں کو رخصت کر دیا۔

ابونُواس کے ہاتھوں سے بادشاہ بھی بچا ہوا نہ تھا۔ ایک بار بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ ابونُواس کے مکان میں چاندی سے بھرے ہوئے برتن دفن ہیں۔ اور صبح سویرے بہت سے مزدور اُس کے مکان پر تعینات کر دیئے کہ وہ زمین کھود کر خزانہ نکال لائیں۔

جب مزدور وہاں پہنچے تو ابونُواس خود موجود نہ تھا۔ اُس کی بیوی کچھ نہیں کر سکتی تھی اُس نے صرف اتنا کیا کہ مزدوروں کے سر پہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگی کہ وہ خزانہ نکالتے بھی ہیں یا نہیں۔ مزدوروں نے ساری زمین کھود ڈالی مگر خزانے کا کہیں پتا نشان نہ ملا۔ ابونُواس جب گھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے مکان کی دیواروں میں غار ہیں اور ساری زمین کُھدی پڑی ہے۔ اُس کی بیوی نے رو رو کر اُس کو سارا واقعہ سنایا۔ ابونُواس نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "پروا نہ کرو۔ میں بادشاہ کو اس کا مزا چکھاؤں گا۔" اور اُس نے بیوی سے کہا، "ایک برتن میں چاول پکا دو۔"

جب چاول پک گئے تو ابونُواس نے انہیں ایک رکابی میں نکالا اور اس پر ایک کپڑا ڈھانپ کے رکھ دیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ ایک ایک کر کے بہت سی مکھیاں کپڑے کے اندر باہر جمع ہونے لگیں۔ ان میں سے کچھ اندر گھس کر چاولوں پر بیٹھ گئیں دوسرے دن صبح

اُس نے وہ برتن اسی طرح اٹھایا اور بادشاہ کے دربار میں لے گیا۔

دربار میں پہنچ کر ابونواس نے بادشاہ سے کہا "میں حضور سے فریاد کرنے آیا ہوں میرے گھر میں کچھ لوگ خود بخود آ گئے اور میرا کھانا کھا گئے ہیں۔"

بادشاہ کو علم نہ تھا کہ ابونواس کس کے بارے میں شکایت کر رہا ہے۔ اُسے خیال ہوا کہ کہیں اُس کا اشارہ اُن مزدوروں کی طرف تو نہیں ہے جو میرے حکم سے اس کے گھر کی زمین کھودنے گئے تھے۔ آخر اُس نے پوچھا "اُس شخص کا نام بتاؤ جس کے خلاف تمہیں شکایت ہے۔"

ابونواس نے چاولوں کی رکابی سے کپڑا ہٹایا اور اُس میں سے تین مکھیاں اُڑ کر چلی گئیں۔ ابونواس نے کہا "مجھے ان کے خلاف شکایت ہے!"

بادشاہ مسکرا کر بولا "تمہارا دعویٰ مکھیوں پر ہے، تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ابونواس نے کہا "میں حضور سے انصاف چاہتا ہوں۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ ان مکھیوں کو قانونی طور پر سزا دی جائے۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "اچھی بات ہے۔ ہم تم کو اجازت دیتے ہیں کہ تم مکھیوں کو سزا دو۔ جہاں کہیں مکھی بیٹھی دیکھو اسے مار دو۔" اور بادشاہ نے ایک کاغذ پر یہ حکم لکھ کر ابونواس کے حوالے کر دیا۔

ابونواس دربار سے چلا آیا۔ اُس نے ایک ڈنڈا بنوایا جس کے سرے پر ایک بھاری موٹھ چڑھوائی اور جگہ جگہ مکھیاں مارنے لگا۔ وہ بازار میں جاتا اور کھجوروں کی دوکان پر مکھیوں کو زور زور سے مارنا شروع کر دیتا۔ ساری کھجوریں اُس کے ڈنڈے سے اِدھر اُدھر بکھر جاتیں۔ پھلوں کی دوکان پر جاتا اور سارے پھلوں کو ڈنڈے مار کر بکھیر دیتا۔ لوگ جب دکاندار شکایت کرتے تو وہ کہتا "میں تو مکھیاں مارتا ہوں جس کی اجازت مجھے قانونی طور پر ملی ہوئی

ہے مجھے تمہاری چیزوں سے کیا مطلب"۔ اور شاہی حکم دکھا دیتا۔ وہ مدتوں اسی طرح کرتا رہا۔ کچھ لوگ اُس کی یہ حرکتیں دیکھ کر اُسے بیوقوف کہتے، کچھ دل لگی سمجھتے۔ بادشاہ بھی اُس کی یہ باتیں سُن کر ہنستا۔

ایک دن بادشاہ کو کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا تھا اور وہ محل کے باہر دربار سجائے اس مقدمہ کی کارروائی میں سنجیدگی سے مصروف تھا۔ ابونُواس بھی اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لئے وہاں پہنچ گیا اور چُپ چاپ شاہی تخت کے قریب بیٹھ گیا۔ جونہی بادشاہ کسی بات پہ غور کرنے لگا، ایک مکھی اُس کی پیٹھ پہ آکر بیٹھی۔ ابونواس نے اپنے مُوٹھ دار ڈنڈے کو زور سے گھما کر اُس کی پیٹھ پہ دے مارا۔ شاہی دربار میں ہلچل مچ گئی۔ ابونواس کو گرفتار کر کے سزا دینے کو لے جانے لگے۔ ابونُوس نے کہا "آپ مجھے کس قصور کی سزا دے رہے ہیں۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ میں نے بادشاہ کے ڈنڈا نہیں مارا ہے میں نے تو اُن کی پیٹھ پہ بیٹھی ہوئی مکھی کو مارا ہے"۔ اور ان لوگوں کو شاہی حکم دکھانے لگا جس پہ بادشاہ کے دستخط موجود تھے۔ اس پہ سب لوگ لاجواب ہو گئے اور ابونُواس کو رہا کر دیا۔ ابونواس نے کہا "مکھیاں سزا پانے کے قابل ہیں کیونکہ وہ میرے گھر میں بلا اجازت داخل ہوئیں۔ اور ان چیزوں پہ قبضہ کرنا چاہا جو اُن کی نہیں تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک امیر سوداگر نے ایک بکرا ذبح کیا۔ اور اُس کا گوشت پکوانے لگا تاکہ کچھ لوگوں کی دعوت کرے۔ جب کھانا پک رہا تھا تو ایک فقیر اُدھر سے گزرا اور کھانے کی خوشبو سونگھ کر ایک طرف ہوا کے رُخ پر بیٹھ گیا۔ جہاں کھانے کی بھاپ اُس کی ناک میں جاتی رہی اور وہ سونگھتا رہا۔ سوداگر نے بیچارے فقیر کو ذرا سا کھانا بھی نہ دیا۔

دوسرے دن وہ فقیر سوداگر سے ملا اور اُس کا شکریہ ادا کرنے لگا کہ "حضور نے مجھے کھانے کے قریب بیٹھنے کی اجازت دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میں نے اُس کی مزیدار خوشبو سے خوب جی بھر لیا اور ایسا معلوم ہوا کہ بکرے کے گوشت سے میرا پیٹ بھر گیا ہو۔"

سوداگر نے چونک کر کہا "اچھا تو یہ بات تھی۔ جب ہی تو بکرے کا گوشت اتنا بے مزا تھا۔ تم نے اُس کی ساری خوشبو اور مزا سونگھ کر اڑا لیا تھا۔" اور پھر سوداگر بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور فقیر کی شکایت کی کہ اس نے کل میرے بکرے کے گوشت کا سارا مزا اور خوشبو اڑا لی۔

بادشاہ نے سوداگر کی طرفداری کی اور اُس کی شکایت بڑے غور سے سُنی۔ اسکے بعد اُس نے فقیر کو حکم دیا کہ وہ سوداگر کو اس کے تاوان میں بارہ چاندی کی مہریں ادا کرے۔ فقیر دربار سے روتا ہوا باہر نکلا۔ کیونکہ اُس غریب کے پاس اتنی رقم کہاں تھی۔ جو ادا کرتا۔ راستہ میں اسے ابونواس ملا۔ اور جو ظلم اور ناانصافی اُس کے ساتھ ہوئی تھی۔ اُس کا سارا حال اُسے سنایا۔ اس پر ابونواس نے کہا۔ "میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم مجھ سے کل ملنا اور ہم تاوان چکانے کی تدبیر کریں گے۔"

دوسرے روز ابونواس فقیر کو ہمراہ لے کر شاہی دربار پہنچا۔ سوداگر وہاں اپنا تاوان لینے کو پہلے سے موجود تھا۔

ابونواس نے سوداگر سے پوچھا "آپ اپنا تاوان وصول کرنے کو تیار ہیں؟"

سوداگر نے کہا "میں تیار ہوں۔"

ابونواس نے بارہ چاندی کی مہریں لے کر فقیر کے ہاتھ میں دیں۔ اور کہا "انہیں زمین پر پھینک دو۔" فقیر نے ایسا ہی کیا۔

پتھر کے فرش پر مہروں کی "چھن چھن" دربار میں گونجنے لگی۔ ابونواس نے سوداگر

سے پوچھا "آپ نے 'چھن چھن' کی آواز سُنی؟" ______ سوداگر نے کہا "جی ہاں میں نے سُنی۔"

ابونواس نے فوراً کہا "بس آپ کا تاوان ادا ہوا، تشریف لے جائیے! —— اگر کوئی شخص پکتے ہوئے کھانے کی خوشبو سونگھ کر اس کی خوشبو اور مزا اڑا سکتا ہے تو مہروں کی 'چھن چھن' کی آواز سے اس کی قیمت یا جرمانہ بھی ادا ہو سکتا ہے۔"

ابونواس کی یہ دلیل سن کر بادشاہ بھی لاجواب ہو گیا اور اس نے حکم سنا دیا کہ سوداگر کے تاوان کی قیمت ادا ہو گئی۔

---

(۱۶)

سینٹ جارج کے اژدہے کی دُم

[اس کہانی کا ماخذ "عربی افسانے اور عوامی قصے" ہے جسے جیب
نی خلیبہ اور چارلس اسکربنرز سنز نیویارک (۱۹۴۹ء) نے مرتب کر کے شائع کیا]

لبنان کے ایک گاؤں میں ایک عیسائی پادری رہتا تھا۔ اس کا نام حنا تھا۔ وہ بہت نیک آدمی تھا۔ پہلے وہ موچی کا کام کرتا تھا۔ گاؤں بھر میں وہی اکیلا بزرگ شخص تھا۔ جو پڑھنا لکھنا جانتا تھا، اس لیے اسے پادری مقرر کر دیا گیا، اس کی مذہبی تعلیم تو بہت معمولی تھی لیکن وہ اپنی اس کمی کو لمبی چوڑی باتیں بنا کر چھپا لیتا اور گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے سامنے مبالغہ سے کام لے کر اپنے وعظ سے ان پر رعب جما لیتا۔

گاؤں کے سردار کا ایک لڑکا تھا، جس کا نام الیاس تھا۔ سردار نے اس لڑکے کو بیروت کے اسکول میں پڑھنے بھیجا اور بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا، جب الیاس گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آیا تو چند روز بعد پادری حنا نے دیکھا کہ لڑکا گرجا گھر نہیں آتا۔ اسکول جانے سے پہلے اس کی عمر بھی کم تھی۔ وہ پابندی سے گرجا گھر کی حاضری دیا کرتا مگر اب جب سے اسکول میں پڑھنے لگا۔ اس نے گرجا گھر جانا چھوڑ دیا۔ پادری کو الیاس کی اس بے جا حرکت سے بہت دُکھ ہوا اس لیے نہیں کہ پادری کو خاص کر اس لڑکے کی

روحانی نجات کا خیال تھا بلکہ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ گاؤں کے دوسرے لڑکے بھی اس کو دیکھ کر بگڑ جائیں گے۔

چنانچہ ایک دن پادری صاحب نے راستہ میں جاتے الیاس کو پکڑ لیا، اور گھیر گھار کے اچھی طرح سمجھانے لگا، اس نے کہا "میرے بچے تم گرجا گھر کیوں نہیں آتے! مجھے ڈر ہے کہ یہ تعلیم تمہیں بے دین نہ بنا دے۔"

پہلے تو لڑکے نے ادھر ادھر کے بہانے بنائے، لیکن جب پادری نے اس کی ہر بات کاٹ کر اسے خاموش کر دیا تو آخر وہ بول اٹھا کہ "فادر! سچ تو یہ ہے کہ میں گرجا گھر نہیں آسکتا کیونکہ میں آپ کا مبالغہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس پر پادری نے آہستہ سے کہا "تم پر اللہ کی رحمت ہو، بیٹا، بات یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہے میری تعلیم اس گاؤں کے سوا کسی اسکول میں تو ہوئی نہیں، میرے والد بچپن میں مجھے اپنے ساتھ دکان پر بٹھاتے اور میں ان کے ساتھ گیارہ برس کی عمر تک دوکان کا کام کرتا رہا۔ اب اگر میں کسی بات میں مبالغہ کرتا ہوں۔ تو نیک نیتی سے ہی کرتا ہوں۔ کیونکہ میری سمجھ میں جو آسکتا ہے۔ اسی کو بہتر سمجھتا ہوں، اب تم اچھی تعلیم پا رہے ہو۔ لائق ہو۔ تم گرجا آؤ اور جب مجھ سے کوئی بے جا مبالغہ کی بات سنو تو مجھے ٹوکو تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔"

اس کے بعد دونوں میں یہ طے پایا کہ جو کوئی مبالغہ کی بات ہو گی، الیاس فوراً درمیان میں "اونہوں" کہہ کر اسے ٹوک دے گا اور وہ اس بات کو بدل دے گا۔ لڑکا پادری کی اس بات پر خوش ہو کر گرجا جانے کو راضی ہو گیا، آخر وہ اتوار کے دن گرجا پہنچ گیا اور سب سے پہلی قطار میں اس جگہ کے عین مقابل بیٹھ گیا، جہاں گرجا کے مقدس برتن اور کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ اتفاق سے وہ دن سینٹ جارج کی یادگار کا

دن تھا اور پادری حنّا نے اپنے وعظ میں سینٹ جارج اور اژدہے کی داستان شروع کی۔ اس نے کہا "میرے بچو! میں آپ کو سینٹ جارج کے اژدہے کے بارے میں کیا بتاؤں۔ صرف اس کی دم اتنی لمبی تھی جیسے یہاں سے مصر!"

اس کے بعد اس نے الیاس کی طرف دیکھا، اس نے آہستہ سے کہا "اُونہوں"

اس کا مطلب تھا کہ یہ بھاری مبالغہ ہے چنانچہ پادری نے اپنے فقرے کو دہرایا۔ اب کی بار اس نے مصر سے قریب ہی ایک مقام چُن کر اس کی مثال دی اور کہا کہ "اس کی دم اتنی لمبی تھی جیسے یہاں سے غازہ!"

الیاس نے پھر کہا "اونہوں!"

اور پادری نے بدل کر پھر کہا "غازہ تو نہیں۔ مگر ہاں اتنی لمبی سمجھو جیسے یہاں سے بیت المقدس"

الیاس نے پھر کہا "اونہوں"

اس پر پادری نے کہا "اگر بیت المقدس نہیں تو بیروت تک ضرور ہو گی"

الیاس کی آواز آئی "اُونہوں"۔ حنّا نے کہا "یہ بھی نہ سہی تو جونا تک لمبی ہو گی" ____ مگر الیاس کی آواز پھر سنائی دی "اونہوں"

پادری تنگ آ چکا تھا اور دُم کو اس سے چھوٹا کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، اس لئے اس نے دوبارہ اسی کو دہرایا کہ یقیناً وہ دُم جونا تک لمبی ضرور ہو گی"

الیاس اونہوں کہتا رہا۔

اس پر پادری حنا احتجاج کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سامنے اٹھائے ہوئے جھک کر کھڑا ہوا اور چلّا اٹھا "بیٹا اگر تم چاہتے ہو کہ اژدہے کی دُم بالکل نہ ہو تو پھر یہی سہی سمجھ لو کہ سینٹ جارج کا اژدہا بغیر دم کے تھا!"

(۱۷)

گھوڑا آزاد ہو کر پچھتایا

[یہ کہانی "مشاہیر اور گھوڑوں کی حیرت انگیز کہانیاں" سے لی گئی ہے۔ جسے فرانسس کارپنٹر نے مرتب کیا اور رڈولیبڈے اینڈ کمپنی نیویارک نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔]

ایک دن ایک بدو لڑکا اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھیڑوں کے بالوں کے خیمہ میں پڑا آرام کر رہا تھا۔ خیمہ کی کالی چھت انھیں دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ سے بچانے کو کافی تھی اور وہ فرش پر اپنا دُھسہ بچھائے آرام سے لیٹے تھے۔ خیمہ کے باہر سے کچھ شور کی سی آواز آئی۔ باپ بیٹے نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ لڑکے کا گھوڑا، سعد، خیمہ کا کپڑا اٹھا کر اپنا منہ اس کے اندر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ باہر کی تیز دھوپ سے بچنے کے لئے خیمہ میں پناہ لینا چاہتا تھا۔ لڑکا اور اس کا باپ یہ دیکھ کر ہنس پڑے۔ گھوڑا اکثر اسی طرح سایہ میں آرام کرنے اندر آجاتا کرتا۔ اور وہ اس سے کچھ نہ کہتے۔ باپ نے کہا "سعد خوب جانتا ہے کہ جہاں اس کا مالک ہے اس جگہ آرام ملے گا۔ مجھے ایک گھوڑے کا قصہ یاد ہے جو سمجھتا تھا کہ مالک سے چھٹکارا حاصل کر کے زیادہ آرام سے رہے گا۔"

لڑکے نے پوچھا "ابا! پھر اُس گھوڑے کا کیا بنا؟"

باپ نے قصہ بیان کرنا شروع کیا "تعریف اس خدائے پاک کی جس نے ہر چیز بنائی ــــــ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب گھوڑے بات چیت کرتے تھے۔ یہ گھوڑا اسعد کی طرح سیدھا سادہ نہ تھا اور کبھی خوش نہ رہتا، اس کی عادتیں جنگلی تھیں۔ اُس کو سب سے زیادہ آزاد رہنا پسند تھا۔ وہ ہر وقت دوسرے گھوڑوں، اونٹوں اور تمام مویشیوں سے شکائتیں کرتا رہتا۔ سب اس سے کہا کرتے کہ میاں گھوڑے تم سخت بیوقوف ہو۔ تمہیں کچھ خبر نہیں کہ آرام کس بات میں ملتا ہے۔"

آخر گھوڑے نے ایک دن اپنے مالک سے شکایت کی کہ "آپ مجھے جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کیا میں آپ سے بڑا نہیں ہوں کیا میں آپ سے زیادہ طاقتور نہیں۔ انسان گھوڑے کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے میں آپ کا حکم کیوں مانوں!"

مالک نے جواب دیا "ہاں بھئی تم سچ کہتے ہو۔ واقعی میں تمہارے برابر طاقتور نہیں ہوں لیکن اس ریگستان میں تم میرے بغیر گزارہ نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کسی اور جگہ حالت کچھ اور ہو لیکن ریگستانی علاقے میں تمہارا گزارہ اکیلے بہت دشوار ہے۔ میں تمہیں کھانا دیتا ہوں، چرنے کے لئے ہری بھری گھاس کا انتظام کرتا ہوں، کھانے کو جَو اور پینے کو اونٹ کا گرم گرم دودھ لاتا ہوں۔ تمہیں اپنے خیمہ میں آرام سے رکھتا ہوں۔ گڑھے تلاش کرتا پھرتا ہوں تاکہ تمہارے لئے پانی لاؤں اور تم پیاسے نہ رہو۔ اس ساری دیکھ بھال اور آرام کے لئے جو میں تم کو دیتا ہوں۔ کیا تم میرے لئے اتنا بھی نہیں کرنا چاہتے۔ کہ مجھے کہیں جانے کے لئے سواری دے دو۔"

گھوڑے نے جواب دیا "یہ درست ہے کہ آپ میری خبر گیری کرتے ہیں لیکن اس کے بدلے آپ نے مجھے غلام بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے اپنی مرضی سے کہیں آنے جانے

کی اجازت نہیں۔ آپ نے میرے منہ میں سخت لگام دے رکھی ہے، میری کمر پر زین لاد رکھی ہے اور اسے رسیوں سے جکڑ رکھا ہے۔ جو میرے پیٹ میں گھس جاتی ہیں۔ آپ مجھے دوڑائے پھرتے ہیں اور دوڑاتے دوڑاتے میرے پاؤں تھکا ڈالتے ہیں۔ آپ لڑائی کے وقت بھی مجھ پر سوار رہتے ہیں، چنانچہ میں زخمی بھی ہو جاتا ہوں۔ آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ میری آزادی پر اس طرح قبضہ کر رکھیں۔"

مالک نے جواب دیا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ انسان کو یہ حق کس نے دیا ہے جب سے دنیا آباد ہے اسی طرح دیکھنے میں آیا ہے۔ شائد یہ حق اللہ تعالےٰ کی طرف سے ملا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اسی نے انسان کو دنیا کی ہر چیز پر قدرت بخشی ہے۔ البتہ اگر تم اس بات سے اتنے بیزار ہو اور تمہاری خواہش ہے کہ تم کو آزاد کر دیا جائے تو میں تم کو زبردستی پکڑ کر رکھنا نہیں چاہتا" اور اس نے گھوڑے کی لگام الگ کر دی۔ زین اتار ڈالی اور زین کے پالنوں کی رسی کھول کر پھینک دی۔ جس سے گھوڑا بندھا کھڑا تھا۔ گھوڑے نے ایک چھلانگ ماری اور خوشی سے اچھلتا کودتا ایک طرف کو بھاگ گیا۔ گھوڑے کے مالک کا جس مقام پر خیمہ تھا۔ وہ سرسبز و شاداب جگہ تھی اور جس زمانے کا یہ واقعہ ہے وہ موسم بہار تھا۔ چاروں طرف ہری بھری جھاڑیاں لہلہا رہی تھیں۔ اس لئے گھوڑے کو آزادی کے شروع زمانے میں کھانے کو خوب ملتا رہا۔ اور قریب ہی ایک چشمہ بہتا تھا اس چشمہ سے اسے پانی بھی خوب سیر ہو کر پینے کو مل جاتا۔ چنانچہ گھوڑا بڑے آرام سے آزادی کے مزے اڑاتا، کلیلیں کرتا پھرتا، اور چین کی بنسری بجاتا۔

لیکن گرمی کا موسم آیا اور ریتلے میدانوں پر دھوپ کی تیزی اور زردی چھا گئی ہری بھری گھاس سوکھنے لگی۔ پانی کے چشمے اور دریا خشک ہونے لگے۔ گھوڑے کے مالک کے خیمہ کے چاروں طرف سبزہ اور پانی کی جگہ ریت ہی ریت دکھائی دینے لگی۔ دوسرے

گھوڑے اور اونٹ اپنے اپنے مالکوں کے پاس تھے۔ اُن کو دوسری چراگاہوں اور چشموں سے کھانے پینے کو ملنے لگا۔ آزادی پسند گھوڑا بھوکا پیاسا رہ گیا اور ادھر ادھر گھاس پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ مگر اس کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جنگل کے درندے لومڑیاں، لگڑ بھگے اور بھیڑیے شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے۔ ایک دن چاندنی رات میں اس گھوڑے نے دیکھا کہ کوئی کالی کالی سی صورت اُس کے پیچھے بڑھتی چلتی آتی ہے جب اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہو گیا کہ وہ سوائے خونخوار بھیڑیے کے کوئی اور چیز نہیں جو اس کو پھاڑ کھانے کے لئے تاک میں لگا ہوا ہے۔ گھوڑا اس سے بچنے کے لئے بھاگا۔ مگر بھوکا بھیڑیا اس سے زیادہ تیز بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی اُس کے پیچھے سرپٹ بھاگا اور ایک جھپٹے میں گھوڑے کی پیٹھ پر دانت جما دئے۔ گھوڑے نے دولتیاں چلائیں اور پوری قوت سے لاتیں مار مار کر چھٹکارا حاصل کیا اور سرپٹ بھاگ کر بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اس کے پیٹ کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ شکر کر رہا تھا کہ وہ جان سلامت لے کر آ گیا۔ لیکن سوچ رہا تھا کہ زیادہ دیر تک زندہ سلامت نہیں رہ سکے گا کیونکہ دوسرے بھوکے خونخوار درندے جو ریگستان میں گھومتے پھرتے ہیں اُس کو جلد ہی آدبوچیں گے۔

لہولہان گھوڑے کو اب خیال آیا کہ "نہ کاٹھی نہ زین، نہ رسی اور نہ میرے مالک کی جنگ کبھی مجھ کو ایسی اذیت اور دُکھ پہنچا سکتے تھے جس عذاب میں میں اس بھوکے بھیڑیے کے دانتوں سے مبتلا ہوں افسوس مجھے اپنے مالک کے خیمہ کے سوا کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ میں اُس کے پاس کتنے چین آرام سے خوش و خرم تھا۔ نہ کبھی بھوک کی تکلیف تھی، نہ پیاس کی۔ مالک کی سواری میں میں کبھی اتنا نہ تھکا تھا جیسا کہ آج ہوں۔ میں اسے ڈھونڈھ کے چھوڑوں گا۔"

لڑکے نے پوچھا "یا ابو! پھر وہ گھوڑا اپنے مالک کے پاس گیا؟"

باپ نے کہا "بیٹا! میں وہاں موجود ہوتا تو مجھے اس کی خبر ہوتی۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہمیں فرض کر لینا چاہیئے کہ گھوڑے نے مالک کا سراغ لگا لیا ہوگا اور یہ بھی فرض کر لینا چاہیئے کہ اس کے مالک نے اسے معاف کر کے اپنے خیمہ میں جگہ دے دی ہوگی!"

۱۸

دوسروں کی زمین کے پتھر اپنی زمین پر

[اس کہانی میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ بہت پرانے زمانہ سے سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے، اس کو جوزف میلرز نے بیان کیا ہے، اس کا اصل ماخذ بابلی کی کتاب یہودی جلد دوم ہے:]

کسی زمانے میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اس کا بڑا عالیشان محل تھا۔ جس میں نہایت خوشنما باغ تھے۔ اس کے بہت سے نوکر تھے۔ جنہیں وہ رات دن اپنے محل اور باغوں کی درستی اور سجاوٹ میں لگائے رکھتا۔ اُس کے نوکر باغوں میں کھدائی کرتے وقت زمین میں سے جو پتھر نکالتے وہ ایک طرف ڈھیر لگاتے۔ امیر آدمی انہیں حکم دیتا کہ ان پتھروں کو باغ کی دیوار کے باہر سڑک پر پھینک دو۔ چنانچہ وہ ہر روز پتھر جمع کرتے اور دیوار پر سے باہر سڑک پر پھینکتے رہتے۔ جہاں سے راہگیر گزرتے تھے۔

ایک دن امیر آدمی اپنے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ اُس کے نوکروں نے حسبِ معمول اس وقت بھی پتھر سڑک پر پھینکے۔ پڑوس کے گاؤں کا ایک بڈھا راستے سے گزر رہا تھا۔ وہ رُک کر وہیں کھڑا ہو گیا اور امیر سے اس بات کی شکایت کرنے لگا۔ اُس نے کہا "آپ دوسروں کی زمین کے پتھر اپنی زمین پر کیوں پھینک رہے ہیں؟"

امیر نے خفا ہو کر کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں خبر نہیں کہ یہ محل اور اُس کی ساری زمین اور باغ سب میرے ہیں۔ میری ملکیت صرف دیوار تک ہے۔ دیوار سے اس پار سڑک سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔

بوڑھے دیہاتی نے سر ہلایا اور کہا "خدا کی مہربانیوں پر تم اتنا اتراتے ہو کہ یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہتا" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور امیر اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا۔ لیکن اس نے کچھ زیادہ دیر غور نہیں کیا اور جلدی سے نوکروں کے پاس پہنچ کر انہیں پتھر اٹھانے اور فوراً دیوار کے پار پھینکنے کی تاکید کرنے لگا اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ سارے باغ پتھروں سے خالی ہو گئے مگر امیر کا نصیبہ بگڑنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی دولت کم ہونے لگی۔ ایک وقت وہ آیا کہ اس نے پریشان ہو کر اپنے خوشنما شاندار باغ کے کچھ حصے بیچ ڈالے اور اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے سارے باغ بیچنا پڑے اور آخر میں محل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا امیر مفلس اور کنگال ہو گیا۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ کوڑی کوڑی کو محتاج فقیروں کے درجہ کو پہنچ گیا۔

ایک مدت بعد جب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ ایک دن اپنے پرانے عالیشان محل اور باغ کی دیوار کے پاس سڑک پر سے گزر رہا تھا، سڑک پر پتھر پڑے تھے وہ ان پتھروں پر چلتے چلتے لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ ننگے پاؤں پتھروں سے لہو لہان ہو گئے۔ اس وقت اس نے ٹھٹھک کر اس دیوار کی طرف دیکھا۔ اور اس کے سایہ میں اپنے زخمی پاؤں کو آرام دینے کے لئے بیٹھ گیا اب اُسے بار بار بڈھے دیہاتی کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ جو آج سے برسوں پہلے اُس نے کہے تھے کہ "تم دوسروں کی زمین کے پتھر اپنی زمین پر کیوں پھینکتے ہو؟"

(۱۹)

خر خوش کا انصاف

[مصر کی یہ کہانی حبیب خطیبہ کی کتاب "عربی داستانیں اور عوامی کہانیاں" سے لی گئی ہے جسے چارلس اسکربنرز سنز نیویارک نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ خر خوش جس کا پورا نام بہاؤالدین ابن عبداللہ الاسدی خر خوش تھا، سلطان صلاح الدین ایوبی کا غلام تھا جسے سلطان نے آزاد کر کے قاہرہ اور پھر عسکرہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔

اس قسم کی کہانیاں ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہیں، لنکا میں ایسی ہی ایک کہانی "اوی چارپورا کا مقدمہ" بہت مشہور ہے اور وہاں بھی یہ کہانی کہاوت کے طور پر استعمال ہوتی ہے]

مصر میں جب کوئی حاکم غلط فیصلے کرتا اور انصاف کے خلاف حکم دیتا ہے تو کہتے ہیں "یہ خر خوش کا انصاف ہے"۔ مطلب یہ کہ انصاف نہیں۔ بلکہ انصاف کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ایک چور کسی کے گھر میں چوری کرنے کی نیت سے پہنچا۔ گھر کے پچھواڑے کی دیوار سے چڑھا۔ اس میں ایک کھڑکی تھی جو اندر سے بند تھی چور دروآز

پر چڑھ کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکی کا چوکھٹا پرانا اور کمزور تھا۔ چور نے جو زور لگایا تو کھڑکی ٹوٹ گئی اور چور دھڑام سے گرا جس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

دوسرے دن چور لنگڑاتا لنگڑاتا خرخوش کے دربار میں پہنچا جو شہر کا گورنر تھا۔ چور نے خرخوش سے کہا "حضور میں ایک چور ہوں۔ کل میں ایک آدمی کے گھر میں چوری کرنے گیا اس کے گھر کی کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کھڑکی ٹوٹ گئی اور میں گر پڑا جس سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

خرخوش کو یہ سُن کر بہت غصہ آیا۔ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ فوراً اُس مکان کے مالک کو حاضر کریں۔

سپاہی دوڑے ہوئے گئے اور بیچارے مالک مکان کو پکڑ لائے۔ خرخوش نے اسے چور کی بات سُنائی اور کہا "تم نے اپنے گھر میں ایسی پرانی اور کمزور کھڑکی کیوں لگائی تھی جس کی وجہ سے چور کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

مالک مکان یہ سُن کر بہت پٹپٹایا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر خرخوش اُس پر کیوں بگڑ رہا ہے وہ چور سے کیوں نہیں پوچھتا کہ تو چوری کیوں کرتا ہے۔ مگر وہ خرخوش سے تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اُس نے کہا "حضور! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے بڑھئی کو پیسے دیئے تھے اور اس سے کہا تھا کہ کھڑکی مضبوط بنائے مگر اُس نے ایسی کمزور کھڑکی بنائی کہ ذرا دیر میں گر گئی۔"

یہ سُن کر خرخوش نے حکم دیا "بڑھئی کو حاضر کرو۔"

سپاہی بڑھئی کو پکڑ لائے۔ خرخوش نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ "تم نے پورے پیسے لے کر ایسی کمزور کھڑکی کیوں لگائی تھی کہ چور اُسے کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑا اور اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

بڑھئی کو پتہ تھا کہ خرخوش سے بحث کرنا بیکار ہے، اس نے کہا "حضور میرا کوئی قصور نہیں، جب میں کھڑکی میں کیلیں ٹھونک رہا تھا تو ایک خوبصورت عورت سُرخ کپڑے پہنے ادھر سے گذری۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی وجہ سے کیلیں ٹھیک نہ بیٹھ سکیں۔"

خرخوش نے سپاہیوں سے کہا "اس عورت کو اسی وقت حاضر کرو۔"

سپاہی عورت کو لے آئے تو خرخوش نے اس سے پوچھا "تو اتنی خوبصورت کیوں ہے اور اس دن سُرخ کپڑے پہن کر کیوں نکلی تھی، اگر تو اتنی خوبصورت نہ ہوتی اور سرخ کپڑے نہ پہنتی تو بڑھئی تجھے نہ دیکھتا اور کھڑکی میں کیلیں ٹھیک سے لگا سکتا اس طرح چور کی ٹانگ نہ ٹوٹتی۔"

عورت یہ سن کر مسکرانے لگی اور خرخوش سے کہا، "حضور میری صورت تو خدا نے بنائی ہے اور کپڑے رنگریز نے رنگے تھے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

خرخوش نے اسی وقت رنگریز کو پکڑ کر لانے کا حکم دیا، سپاہی بیچارے رنگریز کو پکڑ لائے، اس سے خرخوش نے کہا "تو نے اس عورت کے کپڑے اتنے اچھے کیوں رنگے کہ بڑھئی انہیں دیکھنے لگا اور کھڑکی میں ٹھیک کیلیں نہ لگا سکا جس کی وجہ سے چور کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

رنگریز یہ سُن کر خوف سے کانپنے لگا، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر خرخوش اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوا اور حکم دیا کہ "اس رنگریز کو لے جاؤ اور قید خانے کے دروازے پر اسے پھانسی دے دو۔"

سپاہی رنگریز کو لے گئے مگر دروازہ تھا چھوٹا اور رنگریز تھا لمبا۔ سپاہی اسے دروازے میں لٹکا نہ سکے، خرخوش کے پاس پہنچے اور اسے بتایا کہ رنگریز لمبا ہے ———

اور قید خانہ کے دروازے میں پھانسی پر نہیں لٹکایا جا سکتا۔ یہ سنتے ہی خرخوش نے کہا "تو کسی چھوٹے قد کے رنگریز کو لے آؤ اور اسے پھانسی دے دو۔"

سپاہی گئے اور انہوں نے ڈھونڈ کر ایک پست قد رنگریز کو گرفتار کر لیا اور اس بے چارے کو بغیر کسی قصور کے پھانسی پر لٹکا دیا۔

بس اسی دن سے یہ کہاوت مشہور ہو گئی، جب بھی کوئی غلط فیصلہ یا انصاف کے خلاف کام کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ "یہ تو خرخوش کا انصاف ہے۔"

افریقہ



۲۰

پہاڑ کی آگ

[یہ کہانی مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ ایتھوپیا کی اس کہانی میں اس بات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ "قانون کے الفاظ سے زیادہ اس کی روح کو سمجھنا چاہیے۔ اور اس پر عمل کرنا چاہیے"۔ اس کی کہانی کا ماخذ ہے "پہاڑ کی آگ اور دوسری کہانیاں" جسے ہیرلیڈ کورلینڈر نے مرتب کیا اور وولف لیسلاہو ہولٹ اینڈ کمپنی قائم شدہ نیویارک نے ۱۹۵۰ء میں ناشرین کی اجازت سے دوبارہ شائع کیا۔ اس قسم کی بہت سی کہانیاں ان علاقوں میں مشہور ہیں "نظر لھینا بولنواس" کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔]

پرانے زمانے کا ذکر ہے۔ ادیس ابابا کے شہر میں ایک غریب لڑکا رہتا تھا اس کا نام تھا ارحا یہ لڑکا گرویج کا رہنے والا تھا ادیس ابابا میں ایک سوداگر کے پاس ملازم ہو کر آیا تھا۔ سوداگر کا نام ہپٹسم تھا۔ وہ بہت ہی امیر اور چالاک آدمی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا بھر کی ہر چیز کو جانتا ہے۔

ایک دفعہ سردی کا موسم تھا رات کا وقت، ہوا بہت تیز چل رہی تھی سوداگر نے اپنے نوکر ارحا کو بلا کر کہا کہ کمرے میں آگ جلا دے۔ آگ سلگ گئی تو

سوداگر ارھا سے پوچھنے لگا۔ "بتاؤ انسان کتنی سردی برداشت کر سکتا ہے؟"

ارھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوداگر بولا "کیا کوئی ایسا شخص ہے جو "ان ٹو ٹو" پہاڑ کی اونچی چوٹی پہ رات کے وقت ننگا چلا جائے اور اس سردی میں ساری رات وہاں گزار دے۔" ارھا نے جواب دیا۔ "میں کہہ نہیں سکتا۔ شاید کوئی شخص یہ ہمت کر سکتا ہو۔"

اس پہ سوداگر نے کہا "میں شرط لگاتا ہوں یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ کسی میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے۔"

ارھا بولا "میں سمجھتا ہوں کسی بہادر حوصلہ مند شخص کے لئے پہاڑ کی چوٹی پہ رات بسر کرنا کوئی مشکل نہیں۔"

ہیبیٹم نے کہا "اگر تم اتنے یقین سے کہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ شرط لگا سکتا ہوں اگر تم "ان ٹو ٹو" پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پہ ننگے بدن، بھوکے پیاسے، کمبل اور آگ کے بغیر رات گزار دو اور صبح تک زندہ رہو تو میں تمہیں دس ایکڑ زمین، ایک مکان اور مویشی انعام دوں گا۔" ارھا نے کہا "آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" ہیبیٹم نے کہا "میں قول کا سچا ہوں۔ جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں۔"

اس پہ ارھا نے کہا "مجھے شرط منظور ہے۔ میں کل کی رات پہاڑ پہ بسر کروں گا۔"

ارھا نے یہ شرط تو کر لی مگر وہ سخت پریشان تھا کیونکہ موسم بہت سرد تھا۔ اور شرط مشکل آخر وہ ایک بزرگ کے پاس گیا اور اسے شرط کا حال سنایا۔ اس نے سُن کر کہا "تم جاؤ میں تمہاری مدد کروں گا۔ "ان ٹو ٹو" پہاڑ کے بالکل سامنے وادی کی دوسری طرف ایک اور اونچی چٹان ہے۔ جو دن ہی کو نظر آتی ہے مگر جب شام ہو گی اور اندھیرا چھا جائے گا تو میں اُس چوٹی پر جا کر آگ جلا دوں گا۔ تم سامنے پہاڑ سے اس آگ کو رات بھر دیکھتے

رہنا اس طرح تمہیں سردی اور اندھیرے کا احساس نہیں ہو گا اور تمہیں یہ بھی محسوس ہو گا کہ میں بھی تمہارے پاس ہوں۔ اگر تم ہمت کر کے میری اس بات پر عمل کرو گے تو خواہ کتنی بھی سردی ہو تم رات گزار دو گے۔"

ارھا نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی ہیپشم کے پاس چلا آیا۔ سوداگر نے شرط کے مطابق ارھا کو شام کے وقت اپنے چند خاص ملازموں کے ساتھ "ان ٹوٹو" پہاڑ پر روانہ کر دیا۔ جب اندھیرا چھانے لگا تو ارھا نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور سردی میں ننگا پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے سامنے کی چوٹی پر بزرگ کی جلائی ہوئی آگ کی طرف دیکھنا شروع کیا جو وہاں سے کئی میل دور جل رہی تھی اور زیادہ فاصلے کی وجہ سے ایک روشن ستارے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

جوں جوں رات گذرتی گئی ہوا تیز اور سرد ہوتی گئی۔ اس کے تمام جسم میں سردی گھس گئی اور ہڈیاں تک سخت سردی سے برف ہو گئیں لیکن وہ برابر آگ دیکھتا اور یہی سوچتا رہا کہ سامنے اس کا بزرگ دوست اس کیلئے آگ جلائے بیٹھا ہے۔ اس طرح اس نے تمام رات گزار دی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے کپڑے پہنے اور پہاڑ سے اتر کر اپنے گھر آ گیا۔ ہیپشم اُسے زندہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا کہ "کیا واقعی ارھا رات بھر بغیر کھائے پیئے، ننگا پہاڑ پر جاگتا رہا تھا؟" نوکروں نے کہا "جی ہاں حضور"! اس پر ہیپشم نے ارھا سے کہا "تم بہت مضبوط نکلے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے رات کیسے بسر کی؟ ارھا بولا "میں رات بھر دور کی ایک پہاڑی پر آگ جلتی دیکھتا رہا تھا اس پر ہیپشم نے کہا "کیا کہا! تم آگ کو دیکھتے رہے تھے؟ پھر تو تم شرط ہار گئے ہو۔ اب میں تمہیں زمین اور آزادی کچھ نہیں دوں گا۔ اور تم بدستور میرے غلام ہی رہو گے۔"

ارھا نے کہا "مگر حضور وہ آگ تو میرے قریب نہیں تھی بلکہ وہاں سے کئی

میل دُور سامنے ایک پہاڑ پر جل رہی تھی ہیپٹم نے کہا خواہ کچھ بھی ہو تم شرط ہار گئے ہو۔ اصل میں تم نے اسی آگ کے سہارے رات بسر کی ہے۔ ورنہ تم مر چکے ہوتے۔"

اب ارھا بہت پریشان ہوا اور سیدھا اپنے بزرگ دوست کے پاس گیا اور اس کو تمام حال کہہ سنایا بزرگ نے اس کو مشورہ دیا کہ "تم یہ معاملہ حاکم کے پاس لے جاؤ۔" ارھا یہ معاملہ حاکم کے پاس لے گیا۔ حاکم نے ہیپٹم کو طلب کیا۔ ہیپٹم نے تمام قصہ حاکم کو سُنایا اور اُس کے نوکروں نے بھی گواہی دی کہ ارھا رات بھر آگ کو دیکھتا رہا تھا اس پر حاکم نے ہیپٹم کے حق میں فیصلہ دے دیا اور ارھا سے کہا۔ "تم واقعی شرط ہار گئے ہو کیونکہ تم نے آگ کی مدد سے رات گزاری ہے۔ یہ بات شرط کے خلاف ہے۔" آخر ارھا پھر بزرگ کے پاس گیا اور اس کو حاکم کا فیصلہ سنایا بزرگ نے کہا "ہمت نہ ہارو، تم جیتو گے۔" اس کے بعد وہ اٹھا اور ارھا کو لے کر ہیلو نامی ایک شخص کے پاس گیا جو بہت عقلمند تھا۔ ارھا نے اُسے تمام حال سُنایا۔ ہیلو بولا "کوئی فکر کی بات نہیں، میں اس معاملے پر غور کروں گا اور جیت تمہاری ہو گی۔"

اس کے بعد ہیلو نے ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ شہر کے معزز لوگوں کو دعوت میں بلایا۔ ان لوگوں میں ہیپٹم اور حاکم بھی مدعو تھے۔ دعوت کے مقررہ وقت پر لوگ ہیلو کے گھر میں جمع ہونے لگے۔ قریب ہی باورچی خانہ تھا جس سے مختلف کھانوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سب مہمان کچھ دیر تو بیٹھے رہے، مگر کئی گھنٹے گزر گئے اور کھانا کمرے میں نہیں آیا۔ اب وہ سب حیران ہوئے کہ وجہ کیا ہے۔ کھانوں کی خوشبو تو آ رہی ہے مگر کھانا نہیں آتا۔ آخر تنگ آ کر ایک مہمان نے ہیلو سے پوچھا "میاں تم نے ہم لوگوں کو کیوں دعوت دی تھی۔ اتنا عرصہ ہو گیا۔ کھانا کمرے میں نہیں آتا۔" ہیلو بولا "کیا کھانا کھانا بھی ضروری ہے۔ آپ لوگ کھانوں کی خوشبو سونگھئے بس یہی کافی ہے۔" مہمان نے

غصے سے کہا بہت خوب! خوشبو سے پیٹ تو نہیں بھرا کرتا۔" ہیلو نے کہا "اگر
ارھا کے جسم کو کئی میل دُور کی آگ گرمی پہنچا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ لوگوں
کا پیٹ، کھانوں کی خوشبو سے نہ بھر سکے، اور یہ خوشبو تو قریب ہی باورچی خانے
سے آرہی ہے۔ زیادہ دُور بھی نہیں۔"

اب سب مہمان اصل واقعہ کی تہہ کو پہنچے، حاکم کو بھی اپنے غلط فیصلے کا
احساس ہُوا اور ہیلیٹم بھی بہت شرمندہ ہُوا۔ آخر اُس نے ہیلو کی عقلمندی کا شکریہ
ادا کیا اور اعلان کیا کہ میں ابھی ارہا کو آزاد کرتا ہوں۔ اور شرط کے مطابق اس کو دس
ایکڑ زمین مکان اور مویشی دوں گا۔" اس کے بعد ہیلو نے اپنے ملازموں سے کھانا
لانے کو کہا، چنانچہ سب لوگوں نے مزے سے کھانا کھایا اور گھروں کو واپس
چلے گئے۔

۲۱

آسیبی پرندہ

[یہ کہانی "کارلز کی کہانیاں" سے ماخوذ ہے جسے میڈلین مرگیٹ لانڈ" نے سنٹرل نیوز ایجنسی سے ۱۹۴۴ء میں شائع کرایا۔ اس کہانی کا اصل ماخذ زولو کی ایک پرانی روایت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ طفیلی پرندے جو چیچڑی کیڑے کی طرح ہوتے ہیں مویشیوں کی پیٹھ پر کیوں بیٹھتے ہیں، زولو کی عوامی کہانیوں میں مطالعۂ قدرت کی بہت سی عجیب باتیں اور مشاہدۂ فطرت کے دلچسپ قصے بیان کئے گئے ہیں۔ کائنات کی ہر شے کے بارے میں کوئی نہ کوئی شاعرانہ خیال پیش کیا جاتا ہے ان خیالات کو کہانیوں کے پیرائے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جن سے ان چیزوں کی ماہیت ظاہر ہوتی ہے۔ یا اس کی نسبت کوئی خیالی روایت مشہور کر دی گئی ہے۔ جنوبی افریقہ کی کہانیاں عموماً یورپ کے قصوں سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔]

لو بھئی ایک عجیب کہانی سنو! یہ کہانی جنوبی افریقہ کے سفید پرندوں کی ہے، ان کو وہاں "طفیلی پرندے" یا "چیچڑی پرندے" کہتے ہیں، یہ مویشیوں کی پیٹھ پر اس طرح جم کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے چیچڑی۔

کہتے ہیں کہ یہ پرندے دلدل کے علاقوں میں سرکنڈوں کے اندر اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ان پرندوں کے غول سورج کی سمت آسمان پر اڑتے دکھائی دیتے ہیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔ پرانے زمانے میں ان پرندوں کو آسیبی پرندے بھی کہتے تھے۔ کیونکہ ان کی باتیں کچھ بھوت آسیب کی سی معلوم ہوتی تھیں، شروع میں ان کا رنگ سفید نہیں بلکہ سرخ تھا۔

ایک دفعہ کیا ہوا کہ ایک سرخ پرندہ اپنے گھونسلے سے بہت دور نکل گیا اور اڑتے اڑتے کسی اجنبی ملک میں جا پہنچا، وہ بھوک پیاس اور تھکن سے بے دم ہو رہا تھا۔ آخر وہ بے ہوش ہو کر کسی گاؤں میں گر پڑا، گاؤں کا ایک نیک لڑکا اس پرندے کو گرتا دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکے کا نام تھا "ان ڈیپی" لڑکے نے دوڑ کر اس پرندے کو اٹھا لیا اور اس پر ترس کھا کر گھر لے گیا اور اسے خوب دانہ پانی دیا جب پرندے کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک لڑکے کی مٹھی میں ہے۔ پرندہ اس دن سے اس لڑکے سے بہت مانوس ہو گیا، لڑکا اور پرندہ آپس میں گہرے دوست بن گئے۔ لڑکا جہاں بھی جاتا پرندہ اس کے ساتھ ساتھ جاتا، اگر لڑکے کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو پرندہ کہیں نہ کہیں سے لا کر اسے دے دیتا، ایک دن وہ لڑکا اپنے کھیت کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک زہریلی مکڑی اپنے جالے میں لٹکی ہوئی تھی۔ لڑکے نے اسے نہیں دیکھا لیکن اس سرخ پرندے کی نظر اس مکڑی پر پڑ گئی اور اس نے فوراً مکڑی کو مار ڈالا، اس طرح اس نے اپنے دوست لڑکے کی جان بچالی۔ وہ دونوں ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے لیکن بد قسمتی سے اس علاقے میں قحط پڑ گیا، ہوا یہ کہ گرمی کی شدت نے سارے ندی نالوں کو خشک کر دیا۔ بارش بالکل نہ ہوئی اور پانی کی کمی سے ہرے بھرے کھیت سوکھ گئے۔ چارے کی کمی کی وجہ سے مویشی کمزور ہو گئے، لوگوں کے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ رہا۔ پھر بھی بارش کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے، آخر گاؤں کے چوہدری نے لوگوں

کو اکٹھا کیا اور کہا کہ "اب ہمیں اپنا علاقہ چھوڑنا پڑے گا، کیونکہ یہاں پانی بالکل نہیں رہا اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو کسی اور علاقے میں چلنا چاہیئے، ہم صرف اپنے مولیشی ساتھ لے جائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے" آخر دوسرے دن لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے، اس لڑکے کے ماں باپ بھی سفر کے لئے تیار ہو گئے، مگر وہ لڑکا سخت پریشان تھا۔ کیوں کہ اس کا دوست پرندہ غائب تھا۔ لڑکے نے اسے بہت تلاش کیا۔ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن پرندے کو کچھ پتہ نہ چلا، آخر مجبور ہو کر لڑکا اپنے ماں باپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گیا، راستے بھر وہ آسمان کی طرف دیکھتا جاتا تھا کہ شائد اس کا دوست پرندہ نظر آجائے لیکن سُرخ پرندے کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ جب سرخ پرندے نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ بھوکے پیاسے مر رہے ہیں تو وہ ان کے لئے پانی کی تلاش میں گاؤں سے بہت دور نکل گیا، لیکن جب پانی کہیں بھی نہ ملا تو وہ واپس گاؤں کی طرف لوٹا۔ اس عرصے میں "ان ڈیپی" اپنے ماں باپ کے ساتھ گاؤں سے جا چکا تھا اور گاؤں بالکل خالی ہو چکا تھا۔ وہاں نہ دانہ تھا نہ پانی، سُرخ پرندہ سخت تھکا ہوا تھا۔ آخر وہ بھوک پیاس سے بے جان ہو کر "ان ڈیپی" کے گھونسلے میں گر کر مر گیا۔ دوسرے دن پرندے کی لاش سے ایک سفید پرندہ نکلا اور یہ آسیبی پرندہ "ان ڈیپی" کی تلاش میں آسمان کی طرف اڑ گیا۔ بہت دور زمین پر اسے کچھ بیل نظر آئے، وہ نیچے اتر کر ان کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور اس نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے "ان ڈیپی" کو دیکھا ہے؟" بیل بولے "اگر تم ڈوبتے ہوئے سورج کی سمت سفر کرو تو شائد تمہیں "ان ڈیپی" مل جائے" سفید پرندہ غروب ہوتے سورج کی طرف تیزی سے اُڑنے لگا۔ اسے راستے میں جہاں بھی مویشی دکھائی دیتے وہ ان سے پوچھتا "کیا تم نے "ان ڈیپی" اور اس کے خاندان کو دیکھا ہے؟" اور وہ یہی جواب دیتے کہ "غروب ہوتے ہوئے سورج

کی سمت سفر کرو۔" آخر وہ بہت دور تک اُڑتا چلا گیا، لیکن اسے "ان ڈیپی" کا کوئی پتہ نہ چلا۔ کہتے ہیں کہ وہ آسیبی پرندہ آج تک جب کسی مویشی کو دیکھتا ہے تو اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا ہے اور یہی سوال کرتا ہے کہ "کیا تم نے "ان ڈیپی" کو دیکھا ہے؟" اور مویشی ہمیشہ اپنی گردن ہلا کر یہی جواب دیتے ہیں کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ شائد وہ لڑکا مغرب کی طرف چلا گیا ہے،" لیکن آسیبی پرندوں نے اب تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ برابر غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف اُڑتے رہتے ہیں، اور انھیں اب تک "ان ڈیپی" کی تلاش ہے۔

۲۲

لالچی مکڑی

[یہ کہانی ایمن مور لکاٹا لائبیریا سے ماخوذ ہے جس میں ایک قسم کی مکڑی پکانُمنا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس علاقے کی عوامی کہانیوں میں مکڑی کی چالاکی کا اکثر ذکر ہے۔ عام طور پر مغربی افریقہ میں مکڑی کو بہت عیار سمجھا جاتا ہے بعض علاقوں میں اسے انانسی بھی کہتے ہیں۔ عموماً مکڑی عجیب قسم کی ظریف لالچی اور بیوقوف کہلاتی ہے، وہ بڑے بڑے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں پر سبقت لے جاتی ہے۔ بہت سے جنگلی جانور مکڑی کی چالاکی پر حیران ہوتے ہیں۔ مگر کبھی یہ اپنی نادانی کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتی ہے، ویسٹ انڈیز اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقہ میں مغربی افریقہ کی مانند اسے "بہن مکڑی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔]

پرانے زمانے میں دو گاؤں تھے، یہ دونوں قریب قریب ہی آباد تھے، ایک گاؤں کا نام "کے موجو" اور دوسرے کا نام "مو موجو" تھا، ہر سال ان گاؤوں میں میلے اور دعوتیں بھی ہوتی تھیں۔ آس پاس کے علاقوں کے لوگ دعوت اور میلے میں شرکت کے لئے "کے موجو اور مو موجو" کے گاؤں میں چلے جاتے تھے، دونوں گاؤں میں آپس میں دشمنی

تھی اور وہ ہر تہوار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر منانا چاہتے تھے، تہوار کے آخری دن ہر گاؤں میں بہت بڑی دعوت ہوتی تھی اور اس میں ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جتنا بھی چاہے کھانا کھائے۔

ایک مکڑی اس علاقے میں "پیٹو" مشہور تھی، اس کا پیٹ کبھی نہ بھرتا تھا۔ اس مکڑی کا نام تھا "پکاٹنا" پکاٹنا کو جہاں کہیں کھانا دکھائی دیتا، فوراً کھانے لگتی، کے موجو اور موموجو کی دعوتوں میں تو وہ خوب جی بھر کے کھاتی تھی۔ ایک دفعہ پکاٹنا مکڑی نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں گاؤں کی دعوت میں شریک ہو گی۔ مگر دونوں گاؤں کی دعوت کا وقت ملتا جلتا تھا۔ پھر اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ دونوں گاؤں کی دعوت کا ٹھیک وقت ہے کیا! آخر مکڑی نے ایک ترکیب سوچی جس سے وہ دونوں جگہ دعوت کھا سکے اس نے دو آدمیوں کو بلایا اور ایک بہت بڑا رسا لیا۔ وہ رسا اتنا بڑا تھا کہ دونوں گاؤں کے درمیان آسانی سے پھیل سکے مکڑی نے اس رسے کے دو ٹکڑے کیے، ایک ٹکڑے کا ایک سرا ایک آدمی کو دیا اور دوسرا سرا اپنی کمر میں باندھا، اسی طرح رسے کا دوسرا ٹکڑا دوسرے آدمی کو دیا، اس کا دوسرا سرا اپنی کمر میں باندھا اور ان آدمیوں سے کہا کہ تم میں سے ایک کے موجو اور دوسرا موموجو چلا جائے میں ان دونوں گاؤں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہوں۔ جب ان گاؤں میں دعوت شروع ہو تو رسّی کو کھینچنا، جس کی رسّی پہلے کھنچے گی میں اسی گاؤں میں دعوت کھانے چلی جاؤں گی اور دعوت کھانے کے بعد اسی جگہ واپس آ جاؤں گی، پھر جب دوسرا آدمی رسّی کھینچے گا تو میں دوسرے گاؤں میں جا کر دعوت کھا لوں گی۔" چنانچہ ایک آدمی رسے کا ایک سرا لے کر کے موجو چلا گیا اور دوسرا موموجو پہنچ گیا، اور مکڑی درمیان میں کھڑی انتظار کرتی رہی کہ جس طرف کا رسا پہلے کھنچے گا، اسی گاؤں کی دعوت میں جا کر شریک ہو جاؤں۔

مکڑی بڑی دیر انتظار کرتی رہی، مگر وہ حیران تھی کہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی رسا نہیں کھینچا، مکڑی کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اور اسے غصہ بھی

آرہا تھا۔ اتفاق کیا ہوا کہ دونوں گاؤں میں ایک ہی وقت دعوت شروع ہو گئی اور دونوں آدمیوں نے مکڑی کی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی طرف رسّا کھینچنا شروع کر دیا۔ اور اپنے اپنے رسّوں کو اس زور سے کھینچا کہ مکڑی نہ تو ایک طرف جا سکی ار نہ دوسری طرف۔ وہ دونوں برابر رسّا کھینچتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکڑی کی کمر رسّہ کشی سے بھینچ کر بالکل پتلی ہو گئی۔ اس عرصہ میں گاؤں کے لوگوں نے کھانا ختم بھی کر لیا۔ آخر دونوں آدمیوں نے تنگ آکر رسّا کھینچنا بند کر دیا۔ اب وہ دونوں مکڑی کو دیکھنے کے لئے چل پڑے کہ اس کو کیا ہوا! جب وہ مکڑی کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ مکڑی دم توڑ رہی ہے۔ انہوں نے جلدی جلدی رسے کو مکڑی کی کمر سے کھولا، اس کی کمر درمیان سے بالکل پتلی ہو چکی تھی۔ اور اس کا جسم پھول کر کُپّا ہو گیا تھا۔ اس دن سے آج تک مکڑی کی کمر پتلی چلی آتی ہے اور جب بھی کوئی شخص مکڑی کو دیکھتا ہے تو اس کو یہ قصہ یاد آجاتا ہے کہ مکڑی نے دونوں گاؤں کی دعوت میں شریک ہونے کے لالچ میں اپنی کمر دبا کر پتلی کی

یورپ



(۲۴)

شکاری کا بیٹا

[یورپ کے ملک یونان کی یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ اس قسم کی اکثر کہانیاں ہمارے ملک اور دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہیں جن میں ایک آدمی جادو یا دوسرے آدمیوں کی مدد سے بڑے بڑے کام انجام دیتا اور آزمائشوں سے گذرتا ہے۔ اس کہانی میں بھی ایک لڑکا چھ آدمیوں کی مدد سے ایسے ایسے مشکل کام انجام دیتا ہے جو ایک عام آدمی کے لئے ناممکن ہیں۔]

کسی زمانے میں ایک شکاری تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ جب شکاری مرنے لگا تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا اور کہا "شکار بہت مشکل کام ہے۔ شکاری کی زندگی بڑی تکلیفوں میں گزرتی ہے تم اپنے بیٹے کو کوئی اور کام شروع کرنے کا شوق دلانا۔" اور اس کے بعد شکاری مر گیا۔ سب اس کو رو پیٹ کر بیٹھ گئے۔

مدت گزر گئی، شکاری کا بیٹا جوان ہو گیا ایک دن وہ اپنی ماں سے پوچھنے لگا کہ ابا کی بندوق کہاں ہے۔ ماں نے کہا "تمہارے ابا کی خواہش تھی کہ تم شکاری نہ بنو کوئی اور کام سیکھو" لڑکے نے کہا "ابا شکاری کی زندگی سے خوش کیوں نہیں تھے؟" اور یہ کہہ کر اس نے

اپنے باپ کی بندوق اٹھائی اور چپ چاپ جنگل کی طرف چل پڑا جنگل میں دیر تک شکار ڈھونڈنے کے بعد ایک ہرن پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے ہرن کا شکار کیا اور اسے کاندھے پر ڈال کر بیچنے کے لئے شہر لے آیا۔ وہ بازار میں ہرن بیچنے کے لئے بیٹھا ہوا تھا کہ بادشاہ کا ایک وزیر وہاں آپہنچا اور اس سے پوچھا "یہ ہرن کتنے میں بیچو گے؟"

شکاری کے بیٹے نے کہا۔ "آپ کیا دام دیں گے؟"

"دس روپے۔" وزیر نے کہا۔

"یہ تو بہت کم ہیں۔ میں نہیں بیچوں گا۔" شکاری کے بیٹے نے جواب دیا۔

وزیر کو یہ سن کر بہت غصہ آیا وہ سیدھا بادشاہ کے پاس پہونچا اور بادشاہ سے کہا کہ "ایک آدمی بازار میں ہرن بیچ رہا ہے۔ آپ ضرور خرید یں۔ بہت اچھا گوشت ہے۔ مگر ڈیڑھ روپے سے زیادہ قیمت نہ دیجئے۔"

بادشاہ نے شکاری کے بیٹے کو بلوایا، وہ ہرن لئے آپہونچا تو اس سے پوچھا "کیا لوگے اس ہرن کا؟"

شکاری کے بیٹے نے کہا "حضور بہتر جانتے ہیں کہ اس کی قیمت کیا ہونی چاہیئے"

"ڈیڑھ روپیہ کافی ہے۔" بادشاہ نے کہا۔

کس کی مجال تھی کہ بادشاہ سے تکرار کرے۔ شکاری کا بیٹا ڈیڑھ روپے میں بادشاہ کو ہرن دے کر گھر چلا آیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے شکاری کے بیٹے کو بلایا اور کہا "میں اپنے لئے ہاتھی دانت کا ایک محل بنانا چاہتا ہوں۔ تم شکاری ہو اس لئے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جاکر ہاتھیوں کا شکار کرو اور اُن کے دانت جمع کر کے میرے لئے محل بنا دو۔"

شکاری کا بیٹا چپ چاپ کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے کہا خاموش کیوں

کھڑے ہو، بتاؤ تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں، اور اگر تم یہ کام نہ کر سکے تو تمہیں جان سے مار دیا جائیگا۔"

شکاری کے بیٹے نے کہا "حضور ضرور کروں گا" یہ کہہ کر وہ گھر چلا آیا۔ گھر جا کر اس نے اپنی ماں سے کہا کہ "اب میرا زندہ رہنا مشکل ہے، بادشاہ نے اپنے لئے ہاتھی دانت کا محل بنانے کا حکم دیا ہے، یہ کام مجھ سے نہ ہو گا اور بادشاہ ضرور مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے ایک تھیلا اور تھوڑی سی روٹی دے دو، میں کہیں بھاگ نکلوں گا تاکہ بادشاہ کے آدمی مجھے گرفتار نہ کریں۔"

اس کی ماں نے کہا "تمہارے ابا کہا کرتے تھے کہ بڑے پہاڑ پر جو پانی کا چشمہ ہے وہاں بہت سے ہاتھی ہفتے میں ایک دن پانی پینے آتے ہیں، اگر بادشاہ نے ہماری مدد کی تو ہم ان کے دانت نکال سکتے ہیں۔ ہم چشمے کا پانی نکال کر اس میں شراب بھر دیں گے جب ہاتھی یہ شراب پئیں گے تو انہیں نشہ ہو جائے گا اور وہ سو جائیں گے، ہم آسانی سے اُن کے دانت نکال لیں گے۔"

یہ سن کر شکاری کا بیٹا بہت خوش ہوا، دوسرے دن وہ بادشاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ "حضور اگر مجھے شراب کے چالیس پیپے اور چند آدمی مل جائیں تو میں ہاتھی دانت جمع کر سکتا ہوں۔"

بادشاہ نے اُسے شراب کے پیپے اور آدمی دے دیئے۔ وہ یہ سب چیزیں ساتھ لے کر بڑے پہاڑ پر پہنچا اور چشمے کا پانی نکال کر اس میں شراب بھر دی، پھر وہ خود اور اس کے ساتھی جنگل میں چھپ گئے۔ ہاتھی آئے اور پانی میں ملی ہوئی شراب پی کر لڑکھڑانے لگے اور سب وہیں گر کر بیہوش ہو گئے۔ شکاری کا بیٹا اور اس کے ساتھی جنگل سے نکلے اور آسانی سے انہوں نے ہاتھیوں کے دانت نکال لئے۔ اور ہاتھی دانت لیکر انہوں نے بادشاہ کے لئے محل تیار کر دیا۔ وزیر نے جو دیکھا کہ شکاری کا بیٹا اس میں بھی کامیاب رہا تو جل گیا۔ اب اس نے ٹھان لی کہ شکاری کے بیٹے کو مار کر ہی دم لونگا یہ سوچ کر

وہ بادشاہ کے پاس گیا اور کہا "حضور! اُتر کی طرف پہاڑوں میں سات بھائی رہتے ہیں ان کی ایک بہن ہے۔ بڑی خوبصورت۔ آپ اسے ملکہ بنائیں اور نئے محل میں رکھیں تو آپ بہت خوش رہیں گے۔ شکاری کے بیٹے کو بھیجئے وہ اس کو لے آئے گا۔"

بادشاہ یہ سن کر خوش ہوا۔ اس نے شکاری کے بیٹے کو بلا کر حکم دیا کہ "جاؤ اور پہاڑ سے اس لڑکی کو لے آؤ۔"

شکاری کے بیٹے کو یقین ہو گیا کہ یہ کام وہ نہیں کر سکے گا گھر پہنچا کچھ روٹی اور تھیلا لیا اور شمال کی طرف چل پڑا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور نہ یہ خبر تھی کہ وہ پھر کبھی گھر لوٹ آئے گا بھی یا نہیں۔ چلتے چلتے وہ ایک دن دریا کے کنارے پہونچا اس نے دیکھا کہ آدمی وہاں بیٹھا پانی پی رہا ہے۔ وہ آدمی پانی پیتا جاتا تھا اور کہتا جا رہا تھا اُف میری پیاس ہی نہیں بجھتی۔" اور یہ کہتے کہتے اس نے اتنا پانی پیا کہ دریا سوکھ گیا شکاری کا بیٹا یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس آدمی سے پوچھنے لگا "بھائی یہ کیسی پیاس ہے کہ بجھتی ہی نہیں"۔ اس آدمی نے کہا۔ "ہاں میاں میری پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ اور پھر مصیبت یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ اس سفر میں میرا کوئی ساتھی نہیں۔"

شکاری کے بیٹے نے کہا "چلو میرے ساتھی بن جاؤ۔" اور پھر دونوں مل کر چلنے لگے تھوڑی دور گئے تو انہیں ایک آدمی ملا جس نے آگ جلا رکھی تھی۔ وہ آگ تاپتا جاتا اور کہتا جاتا تھا۔ "اُف کتنی سردی لگ رہی ہے۔" شکاری کے بیٹے نے اُسے بھی اسی طرح ساتھ لے لیا۔ اب تینوں مل کر چلنے لگے تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک آدمی ملا جو کھانا کھا رہا تھا۔ یہ آدمی سیروں کھانا چٹ کئے جاتا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا۔ "اُف پیٹ ہی نہیں بھرتا" شکاری کے بیٹے نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔ چاروں مل کر آگے بڑھے تو ایک آدمی ملا۔ یہ آدمی زمین سے کان لگائے لیٹا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس طرح زمین سے کان لگا کر ساری دنیا کی باتیں

سن سکتا ہے۔ شکاری کے بیٹے نے اُسے بھی اپنا ساتھی بنا لیا۔ پانچوں مل کر آگے بڑھے تو انہیں ایک اور آدمی ملا۔ یہ آدمی لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا اور دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے پتھر اٹھا لیتا۔ انہیں زور سے پیچھے کی طرف پھینکتا اور خود اسی زور کے ساتھ آگے کی طرف چھلانگ لگاتا۔ شکاری کے بیٹے نے اس سے کہا "آؤ تم بھی ہمارے ساتھ چلو" اب یہ چھ کے چھ ساتھی روانہ ہوئے۔ تھوڑی دُور گئے۔ تو انہیں ایک اور آدمی ملا۔ یہ آدمی جب چاہتا زمین کو ہلا دیتا اور زلزلہ پیدا کر دیتا۔ یہ بھی شکاری کے بیٹے کے ساتھ ہو گیا اور ساتوں مل کر آگے چلے۔ چلتے چلتے یہ ساتوں اس ٹیبے پہاڑ پر پہنچے جہاں وہ سات بھائی اپنی بہن کے ساتھ رہتے تھے۔

شکاری کے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر ساتوں بھائی نکلے کہ انہیں مار ڈالیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ ساتھوں بھی خوب طاقتور ہیں تو لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور اُن سے پوچھا "تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟"

شکاری کے بیٹے نے کہا "ہم تمہاری بہن کا پیام لیکر آئے ہیں ہمارا بادشاہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ تمہاری بہن کو ہاتھی دانت کے محل میں رکھے گا۔"

ساتوں بھائی یہ سُن کر گھر میں چلے گئے۔ شکاری کے بیٹے نے اپنے اس ساتھی سے جو زمین سے کان لگا کر سب کچھ سن لیتا تھا کہا "ذرا سنو تو وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

اس آدمی نے زمین سے کان لگا کر سننے کے بعد کہا "وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے وہ ہمیں کھانے سے بھرے ہوئے سات بڑے بڑے خوان دیں گے اگر ہم نے سارا کھانا کھا لیا تو وہ اپنی بہن کو ہمارے ساتھ بھیج دیں گے ورنہ نہیں۔"

شکاری کا بیٹا یہ سن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا "مگر ہم اتنا کھانا کیسے کھائیں گے؟"

اس کے ساتھی نے جو ہمیشہ بھوکا رہتا تھا کہا "میں جو ہوں، تم گھبراتے کیوں ہو۔"

تھوڑی دیر بعد ساتوں بھائی گھر سے باہر آئے اور ان ساتوں کو اپنے ساتھ گھر میں لے گئے وہاں انہوں نے کھانے سے بھرے ہوئے سات خوان ان کے سامنے رکھ دیئے، ساتوں نے مل کر کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں چھ کا تو پیٹ بھر گیا اور وہ چپ بیٹھ گئے مگر ساتویں نے سارا کھانا صاف کر دیا۔

مگر اس پر بھی وہ سات بھائی اپنی بہن کو حوالے کرنے پر تیار نہ ہوئے انہوں نے اور تو کہیں انہیں ہرانے کی ترکیبیں، پانی کے سات بڑے بڑے مٹکے لے آئے اور کہا کہ یہ سارا پانی پی لو۔ ہم اپنی بہن تمہارے حوالے کر دیں گے۔ شکاری کے بیٹے کے ساتھی نے جو ہمیشہ پیاسا رہتا تھا۔ ساتوں مٹکوں کا پانی پی لیا اور سارا پانی پی کر کہنے لگا "مجھے تھوڑا سا پانی اور پلاؤ، میں ابھی پیاسا ہوں۔"

ساتوں بھائیوں نے اب ایک اور شرط پیش کی اور کہا کہ "ہمارا ایک گرم حمام ہے تم میں سے کوئی ایک اس کے اندر جا کر تھوڑی دیر بیٹھے تو ہم تمہاری بات مان لیں گے شکاری کے بیٹے کے اس ساتھی نے جسے ہمیشہ سردی لگتی تھی کہا "میں جاؤں گا اس حمام میں، میں تو سردی سے اکڑا جا رہا ہوں۔"

لڑکی کے بھائیوں نے حمام کو اس قدر گرم کر دیا تھا کہ کوئی بھی اس میں جائے تو جھلس کر مر جائے، وہ آدمی اندر چلا گیا تو تھوڑی دیر تک سب اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ نکلا، نہ اس کی آواز آئی۔ انہوں نے حمام کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ چلایا "دروازہ بند کرو، مجھے سردی لگ جائے گی۔"

جب وہ باہر آیا تو لڑکی کے بھائیوں نے کہا "تم لوگوں نے ہماری ساری شرطیں پوری کر دیں مگر ابھی ایک شرط باقی ہے، اگلے پہاڑ پر ایک چشمہ ہے۔ تم میں سے کوئی شخص وہاں

جائے اور چشمے سے تھوڑا سا پانی لے آئے۔ ہماری بہن بھی جاکر پانی لائے گی اگر تمہارا آدمی ہماری بہن سے پہلے پانی لے آیا تو ہم ہارے اور تم جیتے۔"

شکاری کے بیٹے کا وہ ساتھی جو چھلانگیں لگاتا تھا تیار ہوگیا۔ اس نے دو بڑے بڑے پتھر اٹھا کر زور سے پیچھے کی طرف پھینکے اور ایک ہی چھلانگ میں اس پہاڑ پر جا پہنچا چشمے سے پانی لے کر وہ معمولی چال سے واپس آنے لگا۔ راستے میں اسے وہ لڑکی مل گئی۔ وہ ابھی چشمے کی طرف جا رہی تھی۔ اس آدمی نے لڑکی سے کہا "ہم جیت گئے اور تمہارے بھائی ہار گئے۔ آؤ جانے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کریں"۔ لڑکی اس کے پاس بیٹھ گئی مگر اس آدمی کو باتیں کرتے کرتے نیند آگئی۔ وہ سو گیا تو لڑکی نے اس کی بوتل کا پانی اپنی بوتل میں انڈیل لیا اور گھر کی طرف واپس ہونے لگی۔

جب اس کے ساتھی کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو شکاری کے بیٹے کو فکر ہونے لگی۔ اس نے اپنے ساتھی سے زمین کو کان لگا کر سننے کے لئے کہا۔ اس نے زمین کو کان لگا کر سنا اور کہا "ہم تو ہار جائیں گے ہمارا ساتھی راستے میں سو رہا ہے۔ اور لڑکی اس کی بوتل سے پانی لے کر واپس آ رہی ہے۔"

شکاری کے بیٹے کے اس ساتھی نے جو زمین کو ہلا سکتا تھا کہا "ٹھہرو میں اُسے جگاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے زور سے زمین کو ہلایا تو وہ جاگ پڑا اور دیکھا کہ لڑکی اُس کا پانی لے کر چلی گئی۔ اس نے وہیں سے ایک چھلانگ لگائی اور لڑکی کو راستے میں جالیا۔ اس سے پانی چھین کر پھر ایک چھلانگ لگائی اور اپنے ساتھیوں سے آملا۔

شکاری کا بیٹا اور اس کے ساتھی ساری شرطیں جیت چکے تھے۔ اس لئے سات بھائیوں نے اپنی بہن ان کے حوالے کر دی اور شکاری کا بیٹا اس لڑکی اور اپنے ساتھیو کو لیکر بادشاہ کے پاس پہنچا۔

بادشاہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا، مگر وزیر اور بھی جل گیا۔

لڑکی نے پہلے بادشاہ کو، پھر وزیر کو اور پھر ہاتھی دانت کے محل کو غور سے دیکھا اور بادشاہ سے پوچھا۔

"اس محل کے لئے ہاتھی دانت کون لایا تھا؟"

"شکاری کا بیٹا۔" بادشاہ نے کہا۔

"اور محل کس نے بنایا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"شکاری کے بیٹے نے۔" بادشاہ نے کہا۔

"اور مجھے پہاڑوں سے اتنا لمبا سفر کر کے کون لایا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"شکاری کا بیٹا۔" بادشاہ نے کہا۔

لڑکی نے پوچھا "جب شکاری کے بیٹے نے سب کچھ کیا ہے تو میں تم سے شادی کیوں کروں؟" اور پھر اس نے کہا۔ "تمہارا وزیر بُری عادت کی سزا میں چوہا بن جائے اور تم بلی بن کر اس کے پیچھے دوڑتے رہو۔" لڑکی کا یہ کہنا تھا کہ وزیر چوہا بن گیا اور بادشاہ بلی بن کر اسے پکڑنے کے لئے دوڑنے لگا۔ شہر کے لوگوں نے شکاری کے بیٹے کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ اور دونوں مل کر ہاتھی دانت کے محل میں خوشی خوشی رہنے لگے۔

۲۴

بادشاہ کی نصیحت

(یہ کہانی یورپ کے ایک ملک چیکوسلواکیا میں مشہور ہے ۔اسی مضمون اور مطلب کی کہانیاں یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی عام ہیں ،کہیں اس قسم کی کہانیوں سے اتحاد اور اتفاق کا سبق سکھایا گیا ہے تو کہیں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی کو ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیے ۔اس کہانی میں تین لکڑیوں سے اتحاد و اتفاق کا سبق دکھایا گیا ہے !)

آج سے تیرہ سو سال پہلے کی بات ہے ۔یورپ کے مشرق میں ایک بڑی سلطنت تھی ۔ اس میں مورادیہ ،بوہیمیہ ، سلاویکیہ کے ملک شامل تھے ۔جس بادشاہ نے یہ سلطنت قائم کی تھی اس کا نام تھا "سواتوپولک"۔ سواتوپولک بہت ہی عقل مند اور بہادر بادشاہ تھا ۔اس نے اپنی کوشش اور محنت ہی سے اتنے بڑے ملک کی حکومت حاصل کرلی ۔

جب بادشاہ بوڑھا ہوگیا اور بیمار رہنے لگا تو اسے یہ فکر ستانے لگی کہ اس کے بعد اتنے بڑے ملک کا کیا بنے گا ۔ایک دن اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو پاس بلایا ۔ تینوں آکر اس کے بستر کے پاس کھڑے ہوگئے ۔بادشاہ نے ان سے کہا: "میرے بچو! میں

بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں، اب میں زیادہ دن نہ جی سکوں گا۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے اتنی بڑی سلطنت قائم کی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم پر اس کی حفاظت کا بوجھ پڑے گا۔ ہمارے دشمن بہت ہیں جو اس پر دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ اس سلطنت کو دشمنوں سے بچاؤ اور قائم رکھو۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے ایک بوڑھے خادم کو نزدیک بُلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ خادم وہاں سے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد تین لمبی لمبی پتلی چھڑیاں لے کر آیا۔ بادشاہ کے بیٹے یہ چھڑیاں دیکھ کر گھبرا گئے، کیونکہ بچپن میں جب وہ کوئی شرارت کرتے تھے، تو بادشاہ ایسی ہی چھڑیوں سے انہیں پیٹا کرتا تھا۔

بادشاہ بیٹوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا "تم لوگ تو انہیں خوب پہچانتے ہو دیکھو یہ چھڑیاں پتلی پتلی ہیں۔ تم میں سے ہر ایک ایسی چھڑی کو آسانی سے توڑ سکتا ہے"! پھر اس نے چھڑیاں نوکر کو دیں اور کہا انہیں ملا کر باندھ دو۔ نوکر نے تینوں چھڑیوں کو ملا کر ایک مضبوط ڈوری سے کس کر باندھ دیا۔ اب یہ تینوں مل کر ایک چھڑی نظر آتے لگیں پھر بادشاہ نے ان تینوں بیٹوں سے کہا: "مجھے تم تینوں کی طرف سے بڑی فکر ہے تم آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہو۔ اگر تم یونہی الگ الگ لڑتے رہے تو یہ ملک تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور جو تم مِل جُل کر رہو گے تو یہ ملک بھی مضبوط اور قائم رہے گا"۔

یہ کہہ کر بادشاہ نے چھڑیوں کا وہ بنڈل نوکر کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے بیٹوں سے کہا "تم میں سے ہر ایک باری باری اس کو توڑنے کی کوشش کرے"۔

تینوں بیٹوں نے بہت زور لگایا۔ مگر چھڑیاں نہ ٹوٹ سکیں۔ بادشاہ نے کہا "دیکھو یہ ہے اتحاد کی طاقت۔ اگر تم تینوں بھی ایسے ہی مل جل کر رہو گے تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا"۔

پھر بادشاہ نے خادم سے کہا کہ ڈوری کھول کر چھڑیاں الگ الگ کر دے غلام نے تھوڑی دیر میں تینوں چھڑیاں الگ کر دیں۔ بادشاہ نے ایک ایک چھڑی ایک ایک بیٹے کو دی اور کہا "اب اسے توڑنے کی کوشش کرو۔"

تینوں بیٹوں نے بڑی آسانی سے اپنی اپنی چھڑی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا "دیکھو یہ پھوٹ کا نتیجہ ہے۔ اگر تم نے مل جل کر سلطنت کو نہ چلایا اور آپس میں محبت سے نہ رہے تو تم کمزور ہو جاؤ گے اور دشمن تمہیں ختم کر دیں گے۔" میری نصیحت یاد رکھو۔ آپس میں کبھی مت جھگڑو۔ ہمیشہ ایک ہو کر دشمن کا مقابلہ کرو۔ پھر کوئی طاقت تمہیں شکست نہ دے سکے گی۔ انصاف، رحمدلی اور سخاوت کے ساتھ حکومت کرو۔ تمہارا ملک محفوظ رہے گا۔ نہ اندر کوئی خرابی ہوگی اور نہ باہر کے دشمن اسے نقصان پہنچا سکیں گے۔

چند دن بعد بادشاہ مر گیا۔ اس کے تینوں بیٹوں کو اس کی جگہ بادشاہ بنایا گیا۔ مگر انہوں نے باپ کی نصیحت پر عمل نہ کیا۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تینوں بھائیوں کو ختم کر دیا۔ حکومت تباہ ہو گئی۔ بادشاہ سوانوپالک نے اپنی کوشش اور جانفشانی سے جو سلطنت بنائی تھی وہ غیروں کے قبضے میں چلی گئی اور نفاق کا انجام بربادی ہوا۔

۲۵

بہترین خواہش

[یہ کہانی یورپ کے ملک یوگوسلاویہ کی ہے۔ اس کہانی میں یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ جو لوگ امیر ہو کر غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتے ان کی امیری جلد ہی ختم ہو جاتی ہے)

کسی گاؤں میں تین بھائی رہتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک ناشپاتی کا درخت تھا۔ وہ تینوں اس کی بڑی دیکھ بھال اور حفاظت کرتے تھے۔ دو بھائی کسی کام کو باہر جاتے تو تیسرا درخت کی حفاظت کرتا۔

ایک دن آسمان سے ایک فرشتہ آیا۔ فرشتہ یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ یہ تینوں بھائی دل کے سخی ہیں یا کنجوس۔ جس دن فرشتہ ان کے گھر پہنچا۔ اس دن بڑا بھائی درخت کی حفاظت کے لئے گھر پر تھا۔ وہ فرشتہ فقیر کے بھیس میں تھا۔ اس نے کہا۔ "اللہ کے نام پر مجھے ایک ناشپاتی دو" بڑے بھائی نے ایک ناشپاتی اسے دی اور کہا "بابا میں ایک ہی ناشپاتی تمہیں دے سکتا ہوں۔ یہ میری ہے۔ باقی میرے بھائیوں کی ہیں" فرشتہ اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے دن وہ پھر پہنچا تو منجھلا بھائی گھر پہ تھا۔ فرشتے نے اس سے بھی ناشپاتی

مانگی۔ اس نے ایک ناشپاتی فقیر کو دی اور کہا "بابا میں ایک ہی ناشپاتی دے سکتا ہوں۔ یہ میری ہے باقی میرے بھائیوں کی ہیں" فرشتہ اُسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

تیسرے دن چھوٹے بھائی نے بھی اسی طرح ایک ناشپاتی اُسے دی اور وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

چوتھے دن فرشتہ ایک پادری کے بھیس میں ان کے گھر پہنچا۔ گھر پر تینوں بھائی موجود تھے۔ فرشتہ نے ان تینوں سے کہا "بچو! میرے ساتھ آؤ۔ میں ناشپاتی کے اس درخت سے بہتر چیزیں تمہیں دیتا ہوں" تینوں بھائی اس کے ساتھ چل دیئے۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے دریا کے کنارے پہنچے۔ پادری نے بڑے بھائی سے پوچھا "میں تمہاری ایک خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ بتاؤ تمہاری خواہش کیا ہے"

بڑے بھائی نے کہا "میری خواہش ہے کہ اس دریا کا سارا پانی شربت بن جائے۔ اور میں اس کا مالک بن جاؤں"

پادری نے سن کر اپنا ڈنڈا ہوا میں گھمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا کا پانی شربت بن گیا۔ اور وہاں شربت کا ایک بڑا کارخانہ بن گیا جس میں بے شمار آدمی کام کر رہے تھے پادری نے کہا "یہ سب تمہارے نوکر ہیں اور یہ کارخانہ تمہارا ہے۔ اب تم یہاں رہو۔ مگر یاد رکھو۔ امیر بن کر غریبوں کو نہ بھلانا"

یہ کہہ کر پادری نے بڑے بھائی کو وہاں چھوڑ دیا اور باقی دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر آگے چلا۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے میدان میں پہنچے۔ جہاں ہزاروں کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ پادری نے منجھلے لڑکے سے کہا۔

"میں تمہاری ایک خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

منجھلے بھائی نے کہا "میری خواہش ہے کہ یہ تمام کبوتر بھیڑیں بن جائیں۔ اور میں

ان کا مالک بن جاؤں۔"

پادری نے اپنا ڈنڈا ہوا میں گھمایا۔ سارے کبوتر بھیڑیں بن گئے جہاں کھیت تھا دیاں بڑے بڑے مویشی خانے بن گئے۔ وہاں عورتیں بھیڑوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور پنیر مکھن وغیرہ بنا رہی تھیں۔ پادری نے کہا۔

"یہ سب تمہارا ہے۔ مگر یاد رکھو امیر بن کر غریبوں کو نہ بھلانا۔"

یہ کہہ کر پادری نے منجھلے بھائی کو وہیں چھوڑ دیا اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر چلا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے چھوٹے بھائی سے کہا: "اب تم اپنی خواہش بیان کرو۔"

چھوٹے بھائی نے کہا: "میری خواہش یہ ہے کہ مجھے ایک شریف اور وفادار بیوی ملے۔"

پادری نے کہا: "بیٹے تم نے سب سے مشکل خواہش کی ہے۔ دنیا میں اس وقت ایسی عورتیں صرف تین ہیں۔ دو کی تو شادی ہو چکی ہے اور تیسری ایک بادشاہ کی بیٹی ہے اسے بھی دو شہزادوں کے پیام آچکے ہیں۔ خیر چلو میرے ساتھ!"

یہ کہہ کر پادری چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس کو بتایا کہ اس نوجوان کی خواہش کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: "مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ دو شہزادوں کا پیام پہلے سے آچکا ہے۔ اب یہ تیسرا پیام ہے۔"

پادری نے کہا: "اس کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو اور دیکھو غیب سے کیا ہوتا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "وہ کس طرح؟"

پادری نے کہا: "شہزادی سے کہو کہ انگور کی بیل میں سے تین شاخیں کاٹ لے اور ان میں سے ہر ایک کے نام کی ایک ایک بیل الگ الگ آج ہی شام کو لگا دے۔ صبح تک جس

کے نام کی بیل میں انگور لگ جائیں گے۔ اسی سے شہزادی کی شادی ہوگی۔"

بادشاہ کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس نے یہ شرط فوراً منظور کر لی۔ دونوں شہزادے بھی راضی ہو گئے۔ شام کو شہزادی نے تین شاخیں کاٹ کر بیلیں لگا دیں اور ہر ایک بیل پر ایک ایک کے نام کی پرچی بھی لگا دی۔ دوسرے دن شہزادوں کے نام کی بیلیں تو سوکھی پڑی تھیں مگر چھوٹے بھائی کے نام کی شاخ لمبی بیل بن کے پھیل گئی اور اس میں انگور کے خوشے لٹکنے لگے۔ بادشاہ نے چھوٹے بھائی کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شہزادی کی شادی کر دی اور دونوں کو رخصت کیا۔ پادری انہیں اپنے ساتھ ایک جنگل میں لے گیا اور انہیں وہاں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ اس جنگل میں ایک گھر بن گیا اور دونوں میاں بیوی وہاں رہنے لگے۔

ایک سال بعد وہی فرشتہ پھر زمین پر آیا۔ پہلے وہ ایک فقیر کے بھیس میں بڑے بھائی کے شربت کے کارخانے میں پہنچا اور اس سے کہا۔ "مجھے ایک پیالہ شربت دے دو تمہیں بڑا ثواب ملے گا۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "بھاگ جاؤ یہاں سے۔ میں یوں فقیروں کو شربت بانٹتا رہوں گا تو چند ہی دن میں میرا دیوالہ نکل جائے گا اور میں بھی تمہاری طرح فقیر ہو جاؤں گا۔"

فرشتے نے اپنا ڈنڈا ہوا میں گھمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا کارخانہ اور سارے آدمی غائب ہو گئے اور وہاں پہلے کی طرح ایک بڑا دریا بہنے لگا۔ فرشتے نے بڑے بھائی سے کہا۔ "تم نے امیر بن کر غریبوں کو بھلا دیا تھا۔ اب جاؤ اپنے پرانے ناشپاتی کے درخت کی دیکھ بھال کرو۔"

وہاں سے وہ منجھلے بھائی کے پاس پہنچا اور ایک فقیر کے بھیس میں اس سے اللہ کے نام پر تھوڑا سا پنیر مانگا۔

منجھلے بھائی نے ڈانٹ کر کہا "جاتا ہے یہاں سے یا بلاؤں کتوں کو! بڑا آیا پنیر مانگنے والا" فرشتے نے یہ سن کر اپنا ڈنڈا ہوا میں گھمایا۔ ڈنڈا ہوا میں گھمانے کی دیر تھی کہ وہاں نہ بھیڑیں تھیں نہ دودھ۔ مکھن اور پنیر کا کارخانہ اور نہ کام کرنے والی عورتیں۔ پہلے کی طرح کا ایک بڑا میدان تھا جہاں کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ پادری نے منجھلے بھائی سے کہا "تم نے امیر بن کر غریبوں کو بھلا دیا۔ اب جاؤ اپنے پرانے ناشپاتی کے درخت کی دیکھ بھال کرتے رہو"

وہاں سے فرشتہ فقیر کے بھیس میں چھوٹے بھائی کے گھر پہنچا اور آواز لگائی "خدا تمہارا بھلا کرے گا، غریب کو روٹی اور رات گزارنے کو تھوڑی سی جگہ مل جائے۔"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا "بابا ہم بھی غریب ہیں مگر جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ حاضر ہے" یہ کہہ کر وہ اسے اندر لے گیا۔ اس کی بیوی نے آگ جلا کر فقیر کو اس کے پاس بٹھایا۔ چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی اتنے غریب تھے کہ انہیں کھانے کو گیہوں کی روٹی بھی نہ ملتی تھی۔ درختوں کی چھال کو کوٹ کر تنور میں روٹی پکاتے تھے۔ مگر دونوں آپس کے سلوک سے خوش تھے۔

چھوٹے بھائی کی بیوی نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ اپنے مہمان کو کھلانے کے لئے گیہوں کی روٹی بھی ہمارے پاس نہیں ہے"

فقیر نے کہا "کوئی فکر نہ کرو۔ جو تم کھاتے ہو۔ وہی میں بھی کھا سکتا ہوں"

مگر جب چھوٹے بھائی کی بیوی نے تنور سے روٹی نکالی تو گیہوں کی بڑی بڑی روٹیاں نکلیں۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اور خوشی سے اس کے آنسو بہنے لگے۔ پھر اس نے کنوئیں سے پانی بھر کر برتن میں ڈالا تو پانی کی بجائے بہت ہی مزیدار میٹھا شربت نکلا۔ میاں بیوی دونوں یہ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔"

فرشتے نے ان سے کہا "تم نے اپنی خوشی میں غریبوں کو نہیں بھلایا۔ خدا تمہیں اس کا بدلہ دیگا"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ڈنڈا گھمایا تو معمولی گھر ایک عالیشان محل بن گیا۔ جس میں بیشمار نوکر چاکر کام کر رہے تھے۔ فقیر نے مسکراتے ہوئے چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی سے کہا "خدا نے تم کو یہ محل، اس کی دولت اور نوکر چاکر دیئے ہیں۔ جب تک تم غریبوں کا خیال رکھو گے، تمہاری دولت بھی باقی رہے گی۔"

یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا اور چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی خوب آرام چین سے محل میں رہنے لگے۔

---

(۲۶)

بوڑھا مکتب گیا

[روس کے علاقہ یوکرین میں یہ کہانی مشہور ہے - اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ جو اولاد اپنی ماں باپ کی خدمت ان کے بڑھاپے میں نہیں کرتی - اسے آخر کو پچھتانا ہی پڑتا ہے - اس کہانی میں نالائق بیٹوں کو اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ گستاخی کی جو سزا ملی وہ بہت ہی دلچسپ ہے - کئی ملکوں میں ایسی کہانیاں مشہور ہیں -

یہ کہانی قازستان کی پریوں اور عوامی کہانیوں سے ماخوذ ہے - جنھیں آر نسبت بین لارنس انیڈ بولین نے ۱۸۹۴ء میں مرتب کیا - اس کہانی کا پلاٹ "کنگ لیئر" سے ملتا جلتا ہے - جس میں بیٹوں کی بیوفائی کی جگہ بیٹیوں کی بیوفائی کا ذکر ہے - اسی طرح کی سویڈن کی کہانی "روٹی اور نمک" بھی ہے -]

ایک شخص کے چار بیٹے تھے - جب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تو اس نے ایک دن اپنی ساری دولت بیٹوں میں تقسیم کر دی - اس نے سوچا "اب مجھے روپے پیسے کی کیا ضرورت ہے - جتنے دن کی زندگی ہے - اپنے بیٹوں کے پاس گزار لوں گا"

پہلے وہ اپنے بڑے بیٹے کے گھر گیا اور اس کے پاس رہنے لگا - شروع شروع میں تو بڑے بیٹے نے اس کی بہت خدمت اور آؤ بھگت کی اور کہا "آپ کا خیال رکھنا تو

ہمارا فرض ہے" مگر تھوڑے دنوں بعد وہ اپنے باپ سے بیزار ہوگیا۔ اب وہ اس کا ادب بھی نہ کرتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو بوڑھے کو ڈانٹ بھی دیتا۔ بوڑھے کو وقت پر نہ کھانا ملتا تھا اور نہ کپڑا۔

آخر بوڑھا بھی اپنے بڑے بیٹے کے سلوک سے تنگ آگیا اور دوسرے بیٹے کے پاس چلا گیا۔ وہاں بھی چند دن اچھے گزرے اور پھر منجھلا بیٹا بھی بڑے کی طرح اس سے بیزار ہوگیا۔ اس کی بیوی تو بوڑھے کے ساتھ بدزبانی بھی کرتی اور کہتی وہ ہم پہلے ہی مشکل سے گزر بسر کر رہے تھے۔ اب تم نے آکر اور بھی ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ بیچارہ بوڑھا جلد ہی وہاں سے اکتا گیا۔ پھر منجھلے بیٹے کے پاس گیا۔ مگر اس کے سلوک سے بھی پریشان ہوکر چھوٹے بیٹے کے پاس پہنچا اور وہاں سے بھی تنگ ہوکر نکلا۔ بیچارے کو کہیں چین نہ ملا۔ چاروں بیٹے اسے اپنے پاس رکھنے سے بچنا چاہتے تھے۔ کوئی کہتا میرے اتنے بچے ہیں تم کو کیسے رکھ سکتا ہوں، کوئی کہتا میرا گھر چھوٹا ہے تو کوئی کہتا میں تو بہت غریب ہوں۔

بوڑھا چاروں بیٹوں کی خوشامد کرتا۔ ان سے رو رو کر کہتا کہ میں تمہارا باپ ہوں میرے بڑھاپے پر ترس کھاؤ۔ مگر کوئی پروا نہ کرتا۔

ایک دفعہ چاروں بیٹے اکٹھے ہوئے اور سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ بوڑھے کو کسی مکتب میں بھیج دیا جائے۔ وہ روزانہ صبح کو جائے اور رات کو آئے، تھوڑی سی روٹی اسے دے دی جائے۔ بوڑھے نے سنا تو بڑی عاجزی کے ساتھ بیٹوں سے کہنے لگا، مجھے پڑھنا لکھنا تو آتا ہی نہیں۔ میں بوڑھا ہوں۔ میری آنکھوں کو اچھی طرح سجھائی بھی نہیں دیتا۔ اب میں مکتب جا کر کیا کروں گا۔ مجھے کہیں رہنے کو تھوڑی سی جگہ اور ایک روٹی دے دیا کرو میں پڑا رہوں گا"

مگر بیٹوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے گاؤں سے دور ایک مکتب میں زبردستی بھیج دیا۔ بوڑھا بیچارا روتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک امیر آدمی گھوڑا گاڑی میں جا رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کو دیکھا تو گاڑی روک لی اور پوچھا کہاں جا رہے ہو؟"

"مکتب جا رہا ہوں" بوڑھے نے جواب دیا۔

امیر آدمی نے حیرت سے کہا "بڑے میاں اس عمر میں مکتب جاؤ گے یہ تو تمہارے گھر میں آرام سے بیٹھنے کے دن ہیں"

بوڑھے نے اپنی پوری رام کہانی سنائی تو اس نے کہا "بڑے میاں مکتب جانے کا خیال بیکار ہے۔ مگر تم غم نہ کھاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت ریشمی تھیلی نکالی اور اس میں کوئی چیز بھر دی۔ پھر اس تھیلی کو ایک لکڑی کے صندوق میں رکھ کر اچھی طرح بند کر دیا صندوق بوڑھے کو دیتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا۔ بوڑھا صندوق لے کر خوشی خوشی گاؤں واپس پہنچا۔

بوڑھے کے بیٹوں نے جو دیکھا کہ باپ ایک صندوق بغل میں دبائے چلا آ رہا ہے تو سمجھ گئے کہ اس میں ضرور کچھ دولت ہے۔ انہوں نے بوڑھے سے یہ نہیں پوچھا کہ تم مکتب کیوں نہیں گئے بلکہ اس کی خاطر تواضع میں لگ گئے۔ ہر ایک اسے اپنے گھر چلنے کو کہتا۔ پھر انہوں نے اسے خوب کھانا کھلایا۔ کھانے پینے کے بعد بوڑھے نے کہا "میرے بچو اپنی جوانی میں میں نے کچھ دولت جمع کر کے جنگل میں دفن کر دی تھی، مجھے اس کا خیال بھی نہ رہا۔ آج جو ادھر سے گزرا تو یاد آ گیا۔ زمین کھودی تو صندوق جوں کا توں تھا۔ اب یہ میری زندگی تک یونہی بند رہے گا۔ میرے مرنے کے بعد اسے

کھولنا، اور تم میں سے جو بھی زیادہ خدمت کرے گا اور بڑھاپے میں آرام دے گا، اس دولت کا زیادہ حصہ اسی کو ملے گا،،

یہ سن کر چاروں بیٹے آپس میں جھگڑنے لگے کہ آبا کو میں اپنے پاس رکھوں گا اب بوڑھا جس بیٹے کے پاس بھی جاتا - اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی - سب اس کے کھانے کپڑے اور آرام کا خیال رکھتے - اس طرح بوڑھے کی زندگی مزے میں گزرنے لگی -
بہت دنوں تک یونہی آرام سے زندگی گذارنے کے بعد بوڑھا مرگیا - چاروں بیٹوں نے مل کر بڑی شان سے اس کو دفن کیا - شاندار فاتحہ کرائی، غریبوں کو خیرات دی پھر سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد صندوق کھولنے لگے -

مگر صندوق کھولنے سے پہلے ہی چاروں میں تکرار ہونے لگی - ہر ایک کہتا میں نے آبا کی زیادہ خدمت کی ہے - اس لئے بڑا حصہ مجھے ملنا چاہیے،، آخر طے پایا کہ چاروں برابر برابر تقسیم کرلیں گے - صندوق کھولا گیا تو اس میں بڑی خوب صورت ریشمی تھیلی نکلی جس کا منہ بند تھا - اس میں چھن چھن کی آواز آرہی تھی - بڑی بے صبری سے انھوں نے تھیلی کھولی اور فرش پر خالی کردی - مگر دیکھتے کیا ہیں کہ اس میں سے کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گر کر فرش پر پھیل گئے - اس پر چاروں بیٹوں کو بہت غصہ آیا اور وہ آپس میں ہی لڑنے لگے - گاؤں کے دوسرے لوگ یہ دیکھ کر ہنسے اور انھوں نے بوڑھے کے بیٹوں سے کہا دیکھ لی اپنے بوڑھے باپ کی عقل! تم اسے مکتب بھیج رہے تھے مگر دیکھو اس نے تمہیں کیسا مزیدار سبق سکھایا ہے،،

---

(۲۷)

بادشاہ اور کسان

[یہ کہانی "پولینڈ کی عوامی کہانیوں" سے ماخوذ ہے جنہیں لوسیا میریکا یورسکی نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور شیڈ اینڈ وارڈ نیویارک نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ یورپ کے ایک ملک پولینڈ میں یہ کہانی مشہور ہے۔ پرانے زمانے میں پولینڈ پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جس کا نام "کازمیر اعظم" تھا یہ بادشاہ کسانوں پر بڑا مہربان تھا اور کسانوں کا بادشاہ کہلاتا تھا شاید یہ کہانی اسی بادشاہ کے متعلق ہے]

شام ہونے کو تھی سورج غروب ہو رہا تھا۔ بوڑھا کسان میتھو اپنے ہل بیل لے کر گھر لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُسے دُور سے گانے کی آواز آئی۔ میتھو نے پلٹ کر دیکھا تو دُور گھوڑے سواروں کی ایک جماعت آتی دکھائی دی۔ یہ بادشاہ اور اس کے وزیر، امیر اور سپاہی تھے جو شکار سے واپس آ رہے تھے۔ آگے آگے بادشاہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے پیچھے اس کے امیر اور سپاہی خوشنما وردیوں میں بہت شاندار نظر آ رہے تھے۔

بوڑھا کسان ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جب یہ لوگ کھیت کے نزدیک پہنچے تو بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روک دیا اور خود گھوڑے کو بڑھاتے کسان

کی طرف چلا۔ اس کے تین وزیر بھی ساتھ ساتھ تھے۔ بادشاہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بوڑھا میتھو بہت گھبرایا اور ادب سے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے بوڑھے کے نزدیک پہنچ کر گھوڑا روک لیا اور اس سے کہا بڑے میاں۔ شاید آج سویرے اپنا کام کرنے کے لیے نہ اُٹھ سکے۔"

بوڑھے نے کہا: "حضور میں تو سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ مگر خدا کو منظور نہ تھا کہ وقت پر کام پورا ہو سکے۔"

پھر بادشاہ نے پوچھا: "بڑے میاں۔ اس پہاڑی پہ یہ برف کے پودے کب سے اُگے ہوئے ہیں؟"

"چالیس برس سے حضور۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

بادشاہ نے یہ سُن کر سر ہلایا اور کہا "اور پہاڑ کے نیچے سے یہ چشمے کب سے بہہ رہے ہیں؟"

"حضور پندرہ برس سے زیادہ ہو گئے ہیں، جب سے یہ بہہ رہے ہیں" بوڑھے کسان نے کہا۔

"بادشاہ نے کہا۔ "اچھا ایک بات اور بتاؤ بڑے میاں۔ اگر مشرق کی طرف سے تین بیوقوف بطخیں تمہارے پاس آئیں تو تم اچھی طرح ان کی کھال کھینچو گے نا؟"

"خوب اچھی طرح حضور!" بوڑھے نے کہا۔

یہ سُن کر بادشاہ نے ایک سونے کی پیٹی بوڑھے کسان کو دی۔ اور پھر تینوں وزیروں کے ساتھ گھوڑا بڑھا کر لشکر سے جا ملا۔

محل پہنچنے کے بعد بادشاہ اپنے وزیر اور سرداروں کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے بیٹھا۔ کھانے کے بعد بادشاہ نے اپنے تینوں وزیروں سے پوچھا کہ "بتاؤ میں نے

بوڑھے کسان سے جو سوال کئے اور بوڑھے نے جو جواب دیئے۔ ان کا مطلب کیا تھا؟"

تینوں وزیر سوچتے سوچتے تھک گئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ آخر بادشاہ نے ان سے کہا "میں تمہیں بیس دن کی مہلت دیتا ہوں، اگر اس مدت میں تم مجھے صحیح جواب نہ دے سکے تو تمہیں دربار سے نکال دیا جائے گا اور تمہاری جگہ دوسروں کو رکھ لیا جائے گا۔"

تینوں وزیر اسی فکر میں رات دن لگے رہے مگر ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر تینوں بوڑھے کسان مینفو کے پاس پہنچے، کسان نے انہیں بہت عزت سے بٹھایا اور ان کی خاطر تواضع کی مگر جب وزیروں نے اس سے پوچھا کہ "بادشاہ نے تم سے کیا پوچھا تھا۔ اور تم نے کیا جواب دیا تھا؟" تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ وزیروں نے بڑی خوشامدیں کیں۔ آخر تینوں نے ایک ایک سو اشرفیاں اسے دیں تو وہ انہیں بتانے پر راضی ہوا۔ اور ساری اشرفیاں سمیٹ لینے کے بعد کہنے لگا۔

"میں نے بادشاہ کے پہلے سوال کا جو جواب دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے جوانی میں شادی کی۔ میرے بچے بھی ہوئے۔ مگر خدا کی مرضی سے وہ سب مر گئے۔"

"دوسرے سوال کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ چالیس سال پہلے میرا سر سفید ہو گیا۔"

"اور تیسرے جواب کا مطلب یہ تھا کہ میں پندرہ سال سے اپنے بیوی بچوں کے غم میں رو رہا ہوں۔"

اور بادشاہ نے چوتھے سوال میں جن تین بیوقوف بطخوں کا ذکر کیا تھا، وہ آپ لوگ ہیں جو ان باتوں کا مطلب سمجھنے کے لئے میرے پاس آئے ہیں اور میں نے آپ سے تین سو اشرفیاں وصول کر لیں۔ بطخ کی کھال کھینچنے کا یہی مطلب تھا۔" تینوں وزیر بہت شرمندہ ہوئے۔

۲۸

سپاہی کا تھیلا

(یہ کہانی رُوس کے ایک علاقے کی ہے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بھی ایسی کہانیاں مشہور ہیں۔ اس کہانی میں جادُو اور بھوتوں کے قصے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر دنیا سے موت ختم ہو جائے تو زندگی بھی عذاب بن کر رہ جائیگی اس قسم کی ایک کہانی دوزخ جنت کے بارے میں میکسیکو کے علاقے کی بھی مشہور ہے بھوتوں کی کہانی جنہیں دوزخ کے دروازے سے نکالا گیا تھا حبشیوں کے اکثر قصوں میں پائی جاتی ہے جو ریاستہائے متحدہ اور ویسٹ انڈیز میں مشہور ہیں۔)

بہت دنوں کی بات ہے ایک سپاہی بادشاہ کی فوج میں نوکر تھا جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ سپاہی نوکری سے نکل جانے کے بعد ایک راستے پر چل پڑا اور چلتے چلتے سوچنے لگا کہ "بیس سال تک میں نے بادشاہ کی فوج میں نوکری کی اتنے دنوں تک مجھے نہ کھانے کی فکر رہی، نہ کپڑے کی۔ سواری کے لئے ہمیشہ میرے پاس گھوڑا ہوتا تھا۔ مگر آج میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں اور کھانے کے لئے بس تین روٹیاں رہ گئی ہیں"۔

سپاہی یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک بوڑھا فقیر ملا اور خیرات

مانگنے لگا۔ سپاہی نے ایک روٹی نکال کر اُسے دی۔ فقیر دعائیں دیتا چلا گیا۔ سپاہی آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دُور چلا تھا کہ ایک اور بوڑھا فقیر ملا۔ سپاہی نے اُسے بھی ایک روٹی دے دی۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک اور فقیر ملا۔ سپاہی کے پاس ایک ہی روٹی رہ گئی تھی اس نے سوچا آدھی روٹی فقیر کو دے دُوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ "اگر یہ فقیر پہلے دو فقیروں سے ملا ہوگا تو وہ اُسے بتائیں گے کہ میں نے ان کو ایک روٹی دی ہے۔" یہ سوچ کر اس نے پوری روٹی فقیر کو دے دی۔

فقیر نے کہا "خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اگر تم مجھے اپنا حال بتاؤ تو شاید مَیں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

سپاہی نے کہا "بس آپ کی دعا کافی ہے بابا۔"

فقیر نے کہا "میری حالت دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے گدڑی میں سے تاش کی ایک گڈی نکالی اور کہا "تم یہ تاش لے لو۔ جب بھی کھیلو گے، جیت تمہاری ہو گی۔ چاہے تم کتنی بازی لگا کر کھیلو۔ پھر فقیر نے سپاہی کو ایک تھیلا دیا اور کہا۔ تمہیں جو چیز پسند آجائے۔ اسے حکم دو کہ میرے تھیلے میں آجا۔ بس وہ چیز چاہے بڑی ہو یا چھوٹی۔ تمہارے تھیلے میں آجائے گی۔"

سپاہی نے فقیر کا شکریہ ادا کیا اور تاش اور تھیلا لے کر آگے بڑھا۔ چلتے چلتے وہ ایک جھیل کے کنارے پہنچا۔ جھیل میں تین بڑی بڑی قازیں تیر رہی تھیں۔ سپاہی نے سوچا کہ تھیلے کو آزمانا چاہیئے۔ اُس نے تھیلے کا منہ کھول دیا اور کہا۔

"اے قازو میرے تھیلے میں آجاؤ۔"

سپاہی کا یہ کہنا تھا کہ تینوں فازیں جھیل سے اُڑ کر تھیلے میں آ گئیں۔ سپاہی نے تھیلے کا منہ بند کر لیا اور تھیلا کندھے پر ڈال کو چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک شہر میں پہنچا۔ وہاں ایک سرائے میں گیا۔ سرائے کے مالک کو اس نے تینوں فازیں دے دیں اور کہا "ایک تو میرے لئے پکا دو۔ ایک کے بدلے مجھے روٹی لا دو اور تیسری تم لے لو۔" سرائے کا مالک بڑی خوشی سے راضی ہو گیا۔

سپاہی نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا ——— پھر سرائے کے کمرے کی ایک کھڑکی سے باہر کی سیر کرنے لگا۔ سامنے اُسے ایک بڑا محل نظر آیا جو بالکل ویران پڑا تھا۔ سپاہی نے سرائے کے مالک سے پوچھا: "یہ ویران محل کس کا ہے؟"

سرائے کے مالک نے کہا: "یہ اس شہر کے شہزادے کا محل ہے مگر سات سال سے بھوتوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ بھوت ہر رات وہاں جشن مناتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انہیں بھگانے کی کوشش کی۔ مگر خود مارے گئے۔"

یہ سُن کر سپاہی شہزادے کے پاس پہنچا اور اس سے کہا: "اگر آپ مجھے صرف ایک رات اپنے محل میں رہنے کی اجازت دیں تو میں بھوتوں کو بھگا سکتا ہوں۔"

شہزادے نے کہا: "تم بڑے بہادر آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مگر میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی وہاں سے زندہ بچ کر نہ آیا۔"

سپاہی نے بہت اصرار کیا۔ آخر شہزادے نے اسے اجازت دے دی۔ سپاہی محل میں گیا اور ایک عالیشان کمرے میں بیٹھ گیا۔ یہاں شہزادے کا تخت رکھا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر سپاہی نے اپنا حقہ نکالا اور تمباکو بھر کر مزے سے پینے لگا۔

جب آدھی رات گذری تو بھوت جمع ہونے لگے اور سارے محل میں ایک شور مچ گیا اور سارا کمرہ بھوتوں سے بھر گیا۔ بھوت، کھاتے، پیتے، ناچتے اور

کھیلنے میں ایسے مست تھے کہ بڑی دیر تک انہوں نے سپاہی کو دیکھا ہی نہیں پھر جب ان کی نظر اس پر پڑی تو سب اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور کہنے لگے "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ ہمارے کھانے پینے میں شریک ہو جاؤ یا پھر تاش کھیلو۔"

سپاہی نے جواب دیا "میں تمہارے ساتھ تاش کھیلوں گا۔ مگر چاندی سونے کے سکوں کے ساتھ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی تاش کی گڈی نکال لی اور بھوتوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ پہلے بھوتوں نے چاندی کے سکوں کی بازی لگانی شروع کی۔ سپاہی جیتتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے ساری چاندی جیت لی۔ بھوت یہ دیکھ کر چلاتے لگے کہ "یہ تو ہماری ساری چاندی جیت گیا۔"

مگر ان کے سردار نے کہا "کوئی پروا نہیں۔ اب ہم سونے کے سکوں سے کھیلیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے سونے کے سکے لانے کا حکم دیا۔ سپاہی اب بھی جیتتا رہا۔ جب اس نے بھوتوں کا سارا سونا بھی جیت لیا تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کے سردار نے کہا "پکڑ لو اس چور کو اور کھا جاؤ اس کو۔ اس کی ہڈیاں چبا ڈالو۔"

سپاہی نے کہا "اچھا تو یہ بات ہے۔" پھر اس نے اپنا تھیلا نکالا اور اس کا منہ کھول کر پکارا "چلے آؤ اس تھیلے کے اندر۔"

سپاہی کا یہ کہنا تھا کہ سارے بھوت چیختے چلاتے تھیلے میں گھسنے لگے۔ تھیلا تھا تو بہت چھوٹا، مگر سارے بھوت اس میں سما گئے۔ جب سارے بھوت تھیلے میں بھر گئے تو سپاہی نے اس کا منہ مضبوطی سے باندھ دیا اور تھیلا ایک کھونٹے سے لٹکا دیا۔

صبح کو جب شہزادے کے نوکر محل میں آئے، تو سپاہی کو مزے سے سوتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئے، کیونکہ انہیں تو یقین تھا کہ سپاہی مر چکا ہو گا۔ شہزادے

کے نوکروں نے اُسے جگایا۔ اس نے انہیں ساری کہانی سُنا دی اور کہا کہ لوہاروں کو بلا لاؤ

لوہار آئے تو سپاہی نے ان سے کہا: "یہ تھیلا پتھر پر رکھ کر اسے بڑے بڑے ہتھوڑوں سے خوب کُوٹو" لوہار ہتھوڑے چلانے لگے۔ تھیلے میں سے بھوتوں کی آوازیں آنے لگیں جو چیخ چیخ کر سپاہی کی خوشامد کر رہے تھے کہ ہمیں چھوڑ دو۔ ہم پھر کبھی اس محل کا رُخ نہیں کریں گے۔"

سپاہی نے لوہاروں کو روک دیا۔ اس نے تھیلے کا منہ کھولا اور بھوت اس میں سے نکل نکل کر بے تحاشا بھاگنے لگے۔ جب آخری بھوت نکل کر بھاگنے لگا تو سپاہی نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اس سے کہا "پہلے وعدہ کرو کہ مجھے جب تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ تم میری مدد کرو گے۔"

بھوت نے وعدہ کر لیا تو سپاہی نے اُسے بھی چھوڑ دیا۔ جب سارے بھوت بھاگ گئے تو سپاہی چاندی اور سونا لے کر شہزادے کے پاس پہنچا اور اسے ساری کہانی سنائی۔ شہزادہ بہت خوش ہوا اور سپاہی سے کہنے لگا "اب تم میرے بھائی بن کر ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہو۔"

سپاہی بڑے مزے سے زندگی گذارنے لگا۔ اس نے شادی بھی کر لی اور اس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہوا۔

سپاہی اسی طرح ہنسی خوشی دن گذار رہا تھا کہ اس کا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ سارے ڈاکٹر اور حکیم آئے۔ مگر کسی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ سپاہی بڑا پریشان تھا اچانک اُسے بھوت کا خیال آیا اور اس نے پکارا "اے بھوت! تُو نے وعدہ کیا تھا کہ میری مدد کرے گا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔ اسی وقت آجا۔"

سپاہی کے کہتے ہی وہ بھوت آموجود ہوا اور پوچھا "بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

سپاہی نے کہا "میرا لڑکا بیمار ہے۔ کوئی بھی اس کا علاج نہیں کر سکا۔ تم اسے اچھا کر دو۔"

بھوت نے اپنی جیب سے ایک گلاس نکالا اور اس میں صاف پانی بھر کر سپاہی کو دیا اور کہا "اس پانی میں دیکھ کر بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔"

سپاہی نے غور سے دیکھا۔ موت اس کے لڑکے کی پائنتی کھڑی تھی۔ سپاہی نے جو کچھ دیکھا تھا بھوت کو بتایا اور رونے لگا۔ بھوت نے کہا "غم مت کرو۔ تمہارا بیٹا اچھا ہو جائے گا کیونکہ موت اس کی پائنتی کھڑی ہے۔ اگر موت اس کے سرہانے ہوتی تو پھر کوئی بھی اسے بچا نہ سکتا۔" پھر بھوت نے اس گلاس میں سے تھوڑا سا پانی لے کر سپاہی کے لڑکے پر چھڑکا اور وہ اچھا ہو گیا۔

سپاہی نے بھوت سے کہا "یہ گلاس مجھے دے دو۔ میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

بھوت نے وہ گلاس سپاہی کو دے دیا اور چلا گیا۔ اب جہاں کوئی بیمار ہوتا، سپاہی گلاس میں دیکھ کر بتا دیتا کہ وہ اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا۔ سارے شہر میں سپاہی کی شہرت پھیل گئی اور لوگ اسے دور دور سے بلانے لگے۔

ایک دفعہ شہزادہ بیمار پڑ گیا۔ اس نے سپاہی کو بلایا اور کہا "بتاؤ میرا کیا انجام ہونے والا ہے۔"

سپاہی نے گلاس میں پانی بھر کر دیکھا تو موت شہزادے کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے شہزادے سے کہا "میرے بھائی اب تمہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، کیونکہ موت تمہارے سرہانے کھڑی ہے۔"

شہزادے کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا اور اس نے سپاہی سے کہا "تم نے ہزاروں آدمیوں کو مرنے سے بچا لیا۔ مگر مجھے بچا نہیں سکتے۔ یہی ہے بدلہ میری دوستی اور محبت کا؟" اور اس نے حکم دیا کہ سپاہی کو پھانسی دے دی جائے۔

سپاہی کو یہ سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اس نے سوچا کہ "اگر شہزادے کی جگہ میں مر جاؤں تو شہزادہ بچ جائے گا۔" یہ سوچ کر اس نے موت کو بلایا اور اس سے کہا "میں شہزادے کی زندگی لیتا ہوں اور شہزادے کو اپنی زندگی دیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پھر گلاس میں پانی بھر کر دیکھا۔ اب موت شہزادے کی پائنتی کھڑی تھی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ خود اس کے مرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس نے موت سے تین گھنٹے کی مہلت مانگی کہ بیوی بچوں کو خدا حافظ کہہ لے۔ موت نے اجازت دے دی۔ سپاہی نے شہزادے پر پانی چھڑکا اور وہ اچھا ہو گیا۔ اور پھر اپنے گھر گیا۔

سپاہی گھر پہنچا تو اسے بڑی کمزوری محسوس ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے پلنگ تک گیا اور لیٹ گیا۔ موت نے کہا "جلدی سب کو خدا حافظ کہہ لو، وقت کم رہ گیا ہے۔"

سپاہی نے اپنے تکیے کے نیچے سے وہ جادو کا تھیلا نکالا اور موت سے کہا "جلدی سے اس تھیلے میں آجاؤ۔" موت تھیلے میں آگئی تو اس نے خوب مضبوطی سے تھیلے کا منہ بند کر دیا اور ایک گھنے جنگل میں جا کر تھیلا ایک درخت سے لٹکا دیا۔

اب موت قید ہو چکی تھی۔ کوئی مرتا ہی نہ تھا۔ کئی برس اسی طرح گزر گئے ایک دن سپاہی گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بڑھیا نظر آئی۔ بڑھیا اتنی کمزور تھی کہ وہ چل پھر نہ سکتی تھی۔ سپاہی نے اسے سلام کیا اور پوچھا کیا حال ہے بڑھیا نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے آج سے بہت پہلے مر جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ میں اپنی زندگی تو کئی برس پہلے ہی پوری کر چکی تھی۔ مگر کسی نے موت کو قید کر رکھا ہے اس لیئے میں جی رہی ہوں اور یہ مصیبت اٹھا رہی ہوں۔"

سپاہی کو بڑھیا کی حالت پر بڑا ترس آیا اور اس نے سوچا "میں موت کو آزاد

کروں گا، چاہے مجھے خود مر جانا پڑے۔"

یہ سوچ کر سپاہی جنگل میں گیا اور درخت پر سے تھیلا اتار کر پوچھا: "موت کیا تو اب بھی تھیلے میں ہے؟"

موت نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

سپاہی تھیلا لے کر اپنے گھر گیا اور تھیلے کا منہ کھول دیا۔ موت باہر نکل آئی۔ سپاہی بستر پر لیٹ گیا اور سمجھا کہ اب مر جاؤں گا۔ اسی لئے اس نے اپنے بیوی بچوں کو خدا حافظ بھی کہہ دیا۔ مگر جب اس نے موت سے کہا کہ اب مجھے لے چل۔ تو موت نے جواب دیا: "تم نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے۔ میں تمہیں معاف نہ کروں گی اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہاری جان کبھی نہ لوں گی تاکہ مدت تک ایڑیاں رگڑتے رہو۔"

سپاہی نے کہا۔ "اگر موت مجھے نہیں مارتی تو میں خود پاتال جا کر بھوتوں سے کہوں گا کہ مجھے آگ میں جھونک دیں۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے چلا اور کئی مہینے کے سفر کے بعد پاتال پہنچا۔ جہاں بھوت بستے ہیں۔ مگر پاتال کے دروازے پر دربان نے اسے روک دیا اور پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"میں پاتال میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ تاکہ مجھے آگ میں جھونک دیا جائے۔" سپاہی نے کہا۔

"مگر تمہاری پیٹھ پر کیا ہے؟" دربان نے پوچھا۔

"میرا تھیلا ہے۔" سپاہی بولا۔

بھوتوں نے اندر سے سپاہی کو دیکھ لیا۔ وہ اسے پہچان گئے اور چلانے لگے کہ دروازہ بند کر دو۔ دربان نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ سپاہی چلایا: "اے بھوتوں کے سردار مجھے اندر آنے دے۔"

مگر سردار نے جواب دیا "تم اندر نہیں آ سکتے۔ واپس چلے جاؤ"

سپاہی نے کہا "اگر مجھے اندر نہیں آنے دیتے تو پھر دو سو گنہگاروں کی روحیں مجھے دے دو۔ میں انہیں خدا کے پاس پیش کر کے درخواست کروں گا کہ ان کے بدلے مجھے جنّت میں رہنے کی اجازت مل جائے"

سردار نے کہا "میں تمہیں دو سو نہیں بلکہ دو سو پچاس روحیں دیتا ہوں مگر تم یہاں سے چلے جاؤ"

سپاہی نے وہ روحیں تھیلے میں بھر لیں اور جنت کی طرف چلا۔ اس نے جنت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

سپاہی نے جواب دیا "میں ایک سپاہی ہوں اور دو سو روحیں پاتال سے نکال کر لایا ہوں"

دربان نے کہا "روحوں کو اندر بھیج دو۔ مگر تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں ہے"

اب تو سپاہی بہت گھبرایا۔ پھر فوراً ایک ترکیب اس نے سوچی۔ اس نے اپنا تھیلا ایک روح کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا "جب تم جنّت میں پہنچ جاؤ تو تھیلے کا منہ کھول کر پکارنا "سپاہی اس تھیلے میں آجاؤ۔" روح نے وعدہ کر لیا اور تھیلا سپاہی سے لے لیا۔ سب سے آخر میں تھیلے والی روح جنّت میں گئی۔ مگر جنّت میں پہنچتے ہی وہ سپاہی کی بات بھول گئی اور بیچارہ سپاہی دروازے پر کھڑا رہ گیا۔ اب وہ مجبوراً دنیا میں واپس آگیا اور نہ جانے کب تک روتا دھوتا زندگی گذارتا رہا۔

۲۹

سانپ اور خواب

[سوویٹ روس کی یہ کہانی "جارجیا" کی عوامی کہانیوں سے اخذ کی گئی ہے۔ "جارجیا کی عوامی کہانیاں" نامی کتاب ایم وارڈروپ اور ڈیوڈ منٹ نے ۱۸۹۴ء میں مرتب کی تھی۔ اس مجموعے میں ایک کہانی ہے جس کا نام ہے "سانپ اور کسان"۔ یہ کہانی اسی سے ماخوذ ہے]

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ایک رات بادشاہ نے عجیب وغریب خواب دیکھا۔ خواب یہ تھا کہ محل کی چھت سے ایک لومڑی لٹک رہی ہے۔ اس کا سر نیچے ہے اور دُم چھت سے لگی ہوئی ہے۔ بادشاہ سو کر اٹھا تو اُسے یہ خواب یاد آیا۔ اس نے اُسے بھلا دینے کی بہت کوشش کی مگر نہ بھلا سکا۔ جب اس خواب کی یاد نے اُسے بہت پریشان کیا تو اس نے اپنے وزیروں کو جمع کیا اور انہیں وہ خواب سنا کر پوچھا کہ محل کی چھت سے اس طرح لومڑی کے لٹکنے کا کیا مطلب ہے۔

بادشاہ کے وزیر اور مشیر سر جوڑ کر سوچنے لگے مگر اس خواب کا مطلب ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ جب بادشاہ کی پریشانی بہت بڑھ گئی تو اس نے حکم دیا کہ "شہر میں ایک شاندار جلسہ کیا جائے جس میں ملک بھر کے لوگ بلائے جائیں"۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ

اس کی رعایا میں کوئی نہ کوئی اتنا عقلمند نکل آئے گا جو اس خواب کا مطلب بتا سکے۔

بادشاہ کے حکم پر لوگ شہر میں جمع ہونے لگے ان میں ایک غریب کسان بھی تھا جس کا نام "ایوآن" تھا۔ ایوآن جب اپنے گاؤں سے شہر جانے لگا تو اس کا گزر ایک پہاڑی علاقے سے ہوا جہاں راستہ بہت تنگ تھا۔ ایوآن نے دیکھا کہ راستے کے بیچوں بیچ ایک سانپ پڑا ہوا ہے۔ وہ سانپ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور کھڑا ہو گیا۔ سانپ نے باتیں کرنا شروع کر دیں اور ایوآن کو سلام کرنے کے بعد پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

ایوآن نے سانپ کو ساری بات بتائی اور کہا "مگر وہاں جانے کا فائدہ ہی کیا ہے میں تو بادشاہ کے خواب کا مطلب نہیں بتا سکوں گا۔"

سانپ نے کہا "خواب کی صحیح تعبیر بتانے والے کو انعام بھی تو ملے گا۔ وعدہ کرو کہ اس انعام میں سے کچھ مجھے بھی دو گے۔ میں تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔"

ایوآن یہ سن کر بہت خوش ہوا اور بولا "ضرور! ضرور! جو بھی انعام ملے گا۔ اس میں سے آدھا تمہارا۔ اور میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار بھی رہوں گا۔"

سانپ نے کہا "تو سنو خواب کی تعبیر! محل کی چھت سے لومڑی کے اُلٹا لٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں دھوکے بازی، چالاکی اور عیاری پھیلی ہوئی ہے۔"

کسان نے سانپ کا شکریہ ادا کیا اور شہر پہنچا اور جب اس کی باری آئی تو اس نے بادشاہ سے اس کے خواب کا مطلب بیان کر دیا۔ بادشاہ کسان کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے بہت سی دولت اور قیمتی تحفے انعام کے طور پر دیے۔ ایوآن دولت اور تحفے لے کر اپنے گاؤں جانے لگا تو اس نے سوچا کہ "اس میں سے سانپ کو حصہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔" اور یہ سوچ کر وہ ایک دوسرے راستے سے گاؤں پہنچا تاکہ سانپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکے۔

چند دن بعد بادشاہ نے ایک اور خواب دیکھا۔ اس دفعہ بادشاہ نے دیکھا کہ اُس کے محل کی چھت سے ایک تلوار لٹک رہی ہے۔ بادشاہ کو پھر پریشانی ہونے لگی اور اُس نے خواب کی تعبیر بتانے کے لئے ایوآن کو طلب کیا۔ اب ایوآن بہت گھبرایا۔ کیونکہ وہ خود تو خواب کی تعبیر جانتا نہ تھا اور سانپ کو ایک مرتبہ دھوکا دے چکا تھا۔ مگر سانپ کی مدد لئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ ایوآن اس جگہ پہنچا۔ جہاں پہلی مرتبہ سانپ ملا تھا۔ مگر سانپ وہاں موجود نہ تھا۔ ایوآن نے وہیں کھڑے ہو کر سانپ کو پکارنا اور بلانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد سانپ آگیا اور ایوآن سے پُوچھنے لگا۔

"کیا پریشانی ہے تمہیں، مجھے کیوں بلایا ہے؟"

کسان نے کہا: "بادشاہ نے ایک اور خواب دیکھا ہے، مَیں اُس کی کیا تعبیر بتاؤں؟"

سانپ نے کہا: "اگر تم انعام میں سے مجھے بھی حصّہ دینے کا وعدہ کرو تو تمہیں بتاتا ہوں۔"

"مَیں ضرور تمہیں حصہ دُوں گا۔ یہ میرا پکا وعدہ ہے۔" کسان نے کہا۔

سانپ نے کہا "بادشاہ سے کہہ دو کہ تلوار لٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ ہونے والی ہے۔ ملک کے اندر، باہر بادشاہ کے دشمن اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں بادشاہ ملک کو ان سے بچانے کی تیاری کر لے۔"

کسان نے سانپ کا شکریہ ادا کیا اور شہر پہنچا۔ بادشاہ سے اس نے خواب کی تعبیر بیان کر دی۔ بادشاہ ایوآن کی عقلمندی سے بہت خوش ہوا اور بہت سے قیمتی تحائف اُسے دیئے۔"

ایوآن اپنے گاؤں واپس آنے لگا تو اُسے سانپ کا خیال آگیا۔ اُسے بڑا غصہ آیا کہ یہ سانپ کون ہوتا ہے اس سے حصّہ مانگنے والا۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں سانپ

رہتا تھا۔ سانپ نے ایوان کو دیکھا اور کہا "لاؤ میرا آدھا حصّہ!"

کسان نے غصّے سے کہا "تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں سزا ضرور ملے گی۔ یہ کہہ کر اُس نے جیب سے چھُرا نکالا اور سانپ پر جھپٹا۔ سانپ پلٹا اور اپنے بِل میں جا گھُسا مگر ایوان کے چھُرے سے اُس کی دُم کٹ گئی۔ ایوان کو اطمینان ہو گیا کہ اب سانپ اس کے انعام میں حصّہ نہ مانگے گا اور وہ خوش خوش گھر لوٹا۔

اس کے بعد ملک میں ایک بڑی جنگ ہوئی۔ مگر بادشاہ نے پہلے سے تیاری کر لی تھی، جیت اُسی کی ہوئی۔

بہت دنوں بعد بادشاہ نے ایک اور خواب دیکھا کہ "ایک بھیڑ محل کی چھت سے لٹک رہی ہے" بادشاہ نے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لئے ایوان کو بُلا بھیجا۔ ایوان بہت ڈرا۔ وہ سوچنے لگا کہ "اب میں سانپ کے پاس کیسے جاؤں گا۔ مَیں نے اُسے دوبارہ دھوکہ دیا۔ پھر اُسے زخمی بھی کر دیا۔ اب وُہ مجھے خواب کی تعبیر کیوں بتائے گا!"

مگر سانپ سے پوچھے بغیر وہ خواب کی تعبیر نہ بتا سکتا تھا۔ آخر وہ سانپ کے پاس پہنچا اور اُسے بُلایا۔ سانپ آیا تو ایوان نے اُسے ساری بات سنائی۔ سانپ نے پھر وہی کہا کہ "اگر انعام میں سے حصّہ دیتے ہو تو بتاتا ہوں" ایوان نے وعدہ کر لیا۔ سانپ نے کہا "محل کی چھت سے بھیڑ کے لٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ اب سارے ملک میں امن و امان ہے، اور لوگ خوشحال ہیں"

ایوان بادشاہ کے محل میں پہنچا اور بادشاہ کو خواب کی تعبیر بتا دی۔ بادشاہ یہ سُن کر پہلے سے زیادہ خوش ہوا اور بہت زیادہ روپے اور تحفے ایوان کو دیئے۔ ایوان روپے اور تحفے لے کر سانپ کے پاس پہنچا اور آدھا حصّہ اُسے دے دیا۔ پھر ایوان نے سانپ سے کہا "تم نے میرے ساتھ بڑی نیکی کی۔ حالانکہ مَیں نے تمہارے ساتھ بہت

برا سلوک کیا۔ اس وقت کے انعام کا یہ آدھا حصّہ رکھ لو۔ میں گاؤں جا کر پچھلے دانعاموں کا حصّہ بھی تمہیں بھیج دیتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

سانپ نے یہ سن کر ایوان سے کہا: "تمہیں اس پر رنج کرنے کی ضرورت نہیں پہلے جو کچھ ہوا۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ بادشاہ کے پہلے خواب کے وقت ہر طرف دھوکے بازی اور عیاری تھی۔ اس لئے تم نے بھی دھوکے بازی کی اور ایک دوسرے راستے سے گاؤں چلے گئے تاکہ مجھے حصّہ نہ دینا پڑے۔ بادشاہ کے دوسرے خواب کے وقت ظلم و ستم اور جنگ کا زمانہ تھا۔ دوسروں کی طرح تم نے بھی ظلم و ستم سے کام لیا اور اپنے چھرے سے مجھے زخمی کر دیا۔ مگر اب امن و امان کا زمانہ ہے۔ سب انصاف پسند اور سخی بن گئے ہیں۔ اس لئے تم بھی اپنا وعدہ پورا کر رہے ہو۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ یہ ساری دولت تمہاری ہے۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ اور عیش و آرام سے رہو۔"

یہ کہہ کر سانپ اپنے بل میں چلا گیا۔

---

(۳۰)

ضدّی بیوی

[یہ ناروے کی ایک قدیم کہانی ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی حبشہ اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے علاقوں میں مشہور ہے۔]

کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی ضدّی تھی۔ وہ عورت اتنی ضدّی اور ہٹ دھرم تھی کہ ضدّی سے ضدّی آدمی بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ سارے پڑوسی اس سے عاجز تھے، کیونکہ جو بھی کوئی بات کہتا، وہ اس کے خلاف کہتی۔ اگر کوئی کہتا کہ فلاں آدمی نے یہ اچھی نصیحت کی ہے تو وہ فوراً کہتی "اس کی بات تو بالکل واہیات تھی"۔ یہی حال دوکان داروں کا تھا۔ دوکان دار ایک چیز کا نام لیتا، تو وہ دوسری چیز مانگتی۔"

محلّے والے تو خیر اس سے عاجز تھے ہی۔ مگر بیچارے کسان کی جان ہمیشہ عذاب میں رہتی۔ اگر وہ کہتا کہ "آج ہم اپنے بھائی کے پاس جائیں گے"۔ تو یہ فوراً بول اُٹھتی "نہیں نہیں۔ میری بہن کے پاس جانا ہے"۔ کبھی وہ اس سے اپنی قمیص سینے کو کہتا تو وہ اس کے موزے ٹھیک کرنے لگتی۔ وہ چائے مانگتا تو اُسے پانی پلاتی اور پانی مانگتا، تو چائے لے آتی۔ غرض بیچارا جو بات کہتا۔ وہ

اس کے خلاف کرتی۔

محلے والے کبھی کسان سے اس کی بیوی کی شکایت کرتے تو وہ کہتا: "بھائی تمہیں تو کبھی کبھار اس سے سابقہ پڑتا ہے مگر مجھے دیکھو کہ دن رات اس کے ساتھ کس طرح گذر کرتا ہوں۔ میری مصیبت کا تم لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ میں چین سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ زور سے چباتا ہوں تو وہ کہتی ہے۔ آہستہ آہستہ کھاؤ۔ دائیں کروٹ سوتا ہوں تو وہ مجھے نیند سے جگا کر بائیں کروٹ سونے کو کہتی ہے۔"

ایک دن صبح کے وقت کسان اور اس کی بیوی اپنے کھیت کو گئے۔ جہاں انہوں نے رائی بو رکھی تھی۔ کھیت میں پہنچ کر کسان نے کہا: "فصل پک گئی ہے ہم منگل کو فصل کاٹ لیں گے۔"

"منگل کو نہیں پیر کو۔" بیوی نے کہا۔

کسان نے کہا: "چلو پیر کو ہی۔ میں اپنے دوستوں ہاتوارڈ اور ہنس کو بھی ساتھ کام کرنے کے لئے بلالوں گا۔"

بیوی نے کہا: "ان کو کبھی نہ بلانا بلکہ منفوور اور ایرک کو بلانا۔"

بیچارہ کسان ان باتوں کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے کہا: "ٹھیک ہے۔ منفوور اور ایرک کو ہی بلائیں گے۔ اور ہم صبح سات بجے سے کام شروع کر دیں گے۔"

اس پر بیوی نے کہا: "سات نہیں۔ ساڑھے چھ بجے سے۔"

کسان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اس ہفتے موسم اچھا رہے گا۔"

"نہیں بارش ہوگی۔" بیوی نے کہا۔

کسان بولا: "بارش ہو یا دھوپ نکلے، ہم درانتی سے فصل کاٹیں گے۔"

بیوی نے بلند آواز سے کہا: "کیا کہا درانتی سے؟ نہیں فصل قینچی سے کاٹی

جائے گی۔"

"قینچی سے ؟" کسان نے حیرت سے کہا۔" کسی نے آج تک قینچی سے بھی فصل کاٹی ہے۔ نہیں جی! فصل درانتی سے ہی کاٹی جائے گی۔"

" ہرگز نہیں قینچی سے کٹے گی۔" کسان کی بیوی نے بھی بڑے زور سے کہا۔
آخر یہ دونوں بحث کرتے ہوئے دریا کے پُل پر پہنچ گئے۔ کسان نے پھر کہا۔

" درانتی سے۔"

" قینچی سے! قینچی سے!" اس کی بیوی چلائی۔ وہ غصے میں آپے سے باہر تھی اسے کچھ دکھائی نہ دیا اور دریا میں گر پڑی۔ دریا میں گرتے ہی وہ ڈوب گئی۔ مگر جب تھوڑی دیر بعد اُوپر آئی تو کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی بجائے اس نے زور سے کہا۔" قینچی سے!" اور یہ کہہ کر پھر ڈوب گئی۔ جب وہ ڈوبنے لگی تو کسان نے بھی چلا کر کہا " درانتی سے!" تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر اُوپر آئی اور چلانے لگی۔" قینچی سے! قینچی سے!" یہ کہتی کہتی وہ پھر ڈوب گئی اور اب جو اوپر آئی تو کسان نے پکار کر کہا:" درانتی سے۔" مگر اب اس میں بات کرنے کا بھی دم نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ پھر ڈوب گئی۔ مگر ڈوبتے ڈوبتے اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ فصل قینچی سے کٹے گی۔ پھر وہ اوپر نہ آئی۔

کسان گاؤں واپس گیا اور اپنے دوستوں کو خبر کی۔ سب مل کر دریا پر گئے۔ اور کسان کی بیوی کو دریا میں گھس کر ڈھونڈنے لگے۔ بہاؤ کے رُخ پر دُور دُور تک انہوں نے غوطے لگا کر دیکھا۔ مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ سب پریشان تھے کہ آخر وہ بہتے بہتے کہاں چلی گئی۔ مگر کسان نے کہا۔" تم لوگ اُسے نہیں جانتے کہ وہ کتنی ضدی تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی لاش بے شک بہاؤ کے رُخ پر بہہ جاتی۔ مگر وہ ضرور

چڑھاؤ کے رُخ گئی ہوگی۔ چلو اوپر کی طرف دیکھیں۔"

اور جب لوگوں نے پُل کے اُس پار چڑھاؤ کے رُخ پر جا کر دیکھا تو کسان کی بات سچی نکلی۔ اس کی بیوی کی لاش سچ مچ چڑھاؤ کے رُخ پر بہتی جا رہی تھی۔ لوگوں نے کہا: "واقعی حد سے زیادہ ضدّی نکلی!"

۳۱

روٹی اور نمک

[یہ سویڈن کی ایک قدیم کہانی ہے ۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں یہ کہانی مختلف شکلوں میں مشہور ہے اکثر کہانیوں میں "نمک اور روٹی" ہی سے بات بتائی گئی ہے مگر بہنوں کے باہمی حسد کو پیش کرنے کیلئے قصے کو مختلف پیرائے میں پیش کیا گیا ہے دو مشہور داستانیں "کنگ لیئر" "سنڈریلا" اور ایک قدیم انگریزی منظوم داستان "تین بہنیں" اس کہانی سے بہت ملتی جلتی ہیں ۔]

ایک بادشاہ کی تین بیٹیاں تھیں ۔ بادشاہ چھوٹی بیٹی کو سب سے زیادہ چاہتا تھا ۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں اس سے بہت جلتی تھیں ۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگی رہتیں کہ بادشاہ اس سے ناراض ہو جائے ، جب موقع ملتا دونوں بادشاہ سے اس کی شکایت کرتیں اور کہتیں کہ "ہماری چھوٹی بہن تو آپ کی محبت کی قدر ہی نہیں جانتی" آخر یہ باتیں سنتے سنتے بادشاہ بھی بدگمان ہو گیا ۔ ایک دن تینوں بیٹیاں اس کے پاس بیٹھی تھیں ۔ بادشاہ کو خیال آیا کہ انہیں آزمایا جائے ۔ اس نے بڑی بیٹی سے پوچھا "تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو ؟"

بڑی بیٹی نے کہا "میں آپ کو خدا کے برابر سمجھتی ہوں ۔"

بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور منجھلی بیٹی سے پوچھنے لگا " اور تم کتنی محبّت کرتی ہو ؟"

منجھلی بیٹی نے کہا " میں آپ کو اپنی جان کے برابر سمجھتی ہوں "

بادشاہ اور بھی خوش ہوا اور چھوٹی بیٹی سے پوچھا " تم بتاؤ تم مجھے کتنا چاہتی ہو ؟"

چھوٹی بیٹی نے کہا " میں آپ کو روٹی اور نمک کے برابر عزیز رکھتی ہوں "

بادشاہ کو یہ جواب بہت بُرا لگا ۔ اُسے بڑا غصہ آیا کہ چھوٹی بیٹی اُسے نمک اور روٹی جیسی معمولی چیزوں کے برابر سمجھتی ہے ۔ اس نے نوکروں کو بلا کر حکم دیا " اس لڑکی کو اسی وقت محل سے نکال دو "

نوکر شہزادی کو لے گئے اور ایک جنگل میں چھوڑ آئے ۔ دونوں بہنیں اب بہت خوش تھیں ۔ بیچاری چھوٹی بیٹی کا غم اور ڈر کے مارے بُرا حال تھا ۔ کبھی اپنے گھر اور باپ کو یاد کر کے رونے لگتی اور کبھی جنگلی جانوروں کے ڈر سے سہمی جاتی ۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ آخر بادشاہ اُس سے خفا کیوں ہو گیا اور اسے محل سے کیوں نکال دیا ۔ بڑی دیر تک وہ جنگل میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی ۔ پھر جنگلی جانوروں کے ڈر سے ایک درخت پر چڑھ گئی ۔

اس وقت ایک دُوسرے ملک کا بادشاہ اس جنگل میں شکار کے لئے آیا ہوا تھا ۔ اس کے ساتھ شکاری کتّے بھی تھے ۔ کتّے جب اس درخت کے نیچے پہنچے جس پر شہزادی بیٹھی تھی ، تو رک گئے اور اُوپر کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگے ۔ بادشاہ بھی وہاں پہنچا ۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی ریچھ درخت پر چھپا بیٹھا ہے ۔ مگر اوپر دیکھا تو ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی نظر آئی ۔ بادشاہ نے بڑی نرمی سے اُسے نیچے اترنے کو کہا ۔

شہزادی نیچے اتری تو بادشاہ نے اُسے اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور محل میں لے آیا۔ بڑی دیر بعد جب شہزادی کا خوف اور غم کچھ کم ہوا تو اس نے بادشاہ کو اپنی ساری کہانی سنائی۔ بادشاہ کے دل پر اس کی خوب صورتی اور نیکی کا بہت اثر ہوا اور اس سے شادی کی درخواست کی۔ شہزادی بھی بادشاہ کی ہمدردی سے خوش تھی۔ وہ راضی ہو گئی۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور آس پاس کے سات بادشاہ، ملکہ اور شہزادیاں دعوت میں شرکت کے لئے بلائے گئے۔ شادی کے دن وہ سب جمع ہوئے۔ ان میں شہزادی کا باپ اور دونوں بہنیں بھی تھیں۔ مگر وہ شہزادی کو پہچان نہ سکے۔ انہیں تو یقین تھا کہ چھوٹی شہزادی جنگل میں مر گئی ہو گی۔

شاہی دسترخوان چنا گیا۔ سب کھانے کے لئے بیٹھے۔ ایک سے ایک عمدہ کھانا مہمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ مگر کسی چیز میں نمک نہ تھا اور نہ دسترخوان پر روٹی تھی شہزادی کے باپ سے رہا نہ گیا اور اس نے کہا: "میرے خیال میں دو بہترین چیزیں دسترخوان پر نہیں ہیں۔ شاید شاہی باورچی بھول گیا ہے۔"

"وہ کیا چیزیں ہیں؟" شہزادی نے پوچھا۔ جو اب ملکہ بن چکی تھی۔

بادشاہ نے جواب دیا "روٹی اور نمک۔"

شہزادی نے کہا "بے شک دونوں چیزیں لاجواب ہیں۔ مگر ایک دفعہ میں نے اپنے باپ کو ان دونوں چیزوں کے برابر بتایا تو انہوں نے مجھے محل سے نکال دیا تھا اور جنگل میں مرنے کو چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے مجھے ان چیزوں سے ڈر لگتا ہے۔"

بادشاہ نے جب سُنا تو اپنی چھوٹی بیٹی کو پہچان کر فوراً اُٹھا اور سینے سے لگایا اور اس سے معافی مانگنے لگا کہ "اس وقت میں تمہاری بات نہ سمجھ سکا اور غلطی سے

تمہیں سزا دی۔"

بڑی بہنوں کی سازش ظاہر ہو گئی تھی۔ اب بادشاہ نے دونوں کو محل سے نکال دیا اور پھر کسی نے ان کا نام بھی نہ سُنا۔

۳۲

طلسمی تعویذ

[یہ کہانی یورپ کے ملک ڈنمارک کی ہے۔ ڈنمارک کے ایک ادیب "ہنس کرسچین اینڈرسن" نے یہ کہانی لکھی ہے جو اس کی کہانیوں وغیرہ کے مجموعے کی تیسری جلد میں شامل ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "جین ہرشولٹ" نے کیا اور امریکا کے لمیٹڈ ایڈیشن کلب، جارج میسی کمپنیز، نیویارک نے شائع کیا۔]

کسی ملک میں ایک شہزادہ تھا۔ اس نے ایک شہزادی سے شادی کی۔ دونوں بڑے خوش تھے اور شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ مگر ایک خیال انہیں ستاتا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہمیشہ ایسی ہی خوش خوش گذرے جیسی کہ شادی کے بعد شروع شروع کے دنوں میں گزر رہی تھی۔ دونوں نے سوچا کہ اگر کہیں سے ایسا تعویذ مل جائے تو کیسا اچھا ہو جو ہماری خوشی کو پائیدار بنا سکے۔

اسی ملک میں ایک جنگل تھا وہاں ایک بہت ہی عقل مند آدمی رہتا تھا۔ اس کی عقل مندی کے چرچے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شہزادے اور شہزادی نے سوچا کہ اس سے مل کر مشورہ کیا جائے۔ دونوں اس کے پاس گئے اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ "تم دونوں مل کر ملک ملک کی سیر کرو اور ایسے میاں بیوی کو

ڈھونڈو جو ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہوں۔ اُن سے کوئی ایسا کپڑا مانگ لو جو کپڑوں کے اندر پہنتے ہیں جیسے بنیان یا انگیا وغیرہ اور پھر وہ کپڑا ہمیشہ پہنے رہو۔ اس طرح تم دونوں بھی ہمیشہ خوش رہو گے۔"

شہزادہ اور شہزادی ایسے جوڑے کی تلاش میں نکلے جو سدا خوش رہا ہو۔ راستے میں انہیں ایک سردار کا پتہ چلا جو اپنی بیوی کے ساتھ مدت سے بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ دونوں سردار کے پاس پہنچے اور پوچھا "کیا تم میاں بیوی ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہو؟"

سردار نے کہا "ہاں یہ سچ ہے۔ ہم بہت ہی خوشحال ہیں۔ بس ایک کسر ہے ہمارے کوئی اولاد نہیں۔"

شہزادہ اور شہزادی بڑے مایوس ہوئے۔ کیونکہ یہ لوگ ہر طرح سے خوشحال اور مطمئن نہیں کہلائے جا سکتے تھے۔ دونوں پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ اب وہ ایک اور ملک میں پہنچے۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ کسی شہر میں ایک آدمی ایسا ہے جس کی زندگی بڑی خوشحال ہے اور مطمئن ہے۔ دونوں بڑے خوش ہوئے اور جا کر اس آدمی سے ملے۔ شہزادے اور شہزادی نے اس کا حال پوچھا تو اس نے کہا "میں اور میری بیوی ایک دوسرے سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ بس ایک بات ہے کہ ہمارے ہاں بچے بہت ہیں۔ اگر اتنے بچے نہ ہوتے تو ہماری خوشحالی اور فراغت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔"

یہ سن کر شہزادہ اور شہزادی مایوس ہو گئے کیونکہ سچی خوشی یہاں بھی نہ تھی۔ وہ پھر آگے بڑھے اور یوں ہی ملک ملک گھومتے رہے مگر کوئی جوڑا ایسا نہ ملا جو سچ مچ ہر طرح سے خوشحال ہو۔ ایک دن وہ دونوں کھیتوں کے پاس سے گزر

رہے تھے۔ اُنہوں نے راستے پر ایک چرواہے کو دیکھا جو بیٹھا مزے سے بانسری بجا رہا تھا۔ اسی وقت ایک عورت ایک بچّے کو گود میں لئے ہوئے آئی۔ چرواہے نے بچّے کو اپنی گود میں لے لیا اُسے پیار کیا اور اُس سے کھیلنے لگا۔ اتنی دیر میں عورت نے دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا چن دیا اور چرواہے کو کھانے کے لئے بلایا۔ چرواہا دسترخوان پر آبیٹھا۔ اس نے روٹی توڑ کر پہلا نوالہ بچّے کو دیا اور دوسرا اپنے کتے کو۔ پھر خود کھانے لگا۔ شہزادہ اور شہزادی دُور کھڑے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ دونوں سچ مچ خوشحال اور مطمئن ہیں۔ دونوں چرواہے کے پاس گئے اور اس سے پوچھا "کیا تم سچ مچ خوشحال اور مطمئن ہو؟" چرواہے نے کہا "یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم دونوں ہر طرح سے خوش ہیں۔ ہماری جیسی خوشحال زندگی تو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوگی۔" شہزادے نے اس سے کہا "میاں چرواہے ہم پر ایک مہربانی کرو۔ اپنی بنیان یا کسی ایسے کپڑے کا جو تم اندر پہنتے ہو۔ ایک ٹکڑا ہمیں دے دو۔ ہم تمہیں اس کے بدلے بہت کچھ دیں گے۔"

چرواہے نے کہا، "ٹکڑا کیا میں پورا کپڑا دے دیتا۔ مگر میرے یا میری بیوی کے پاس کوئی کپڑا پہننے کو نہیں ہے۔"

یہ سن کر شہزادہ اور شہزادی وہاں سے چلے گئے۔ اب انہیں امید بھی نہ رہی کہ جس چیز کی تلاش میں وہ پھر رہے ہیں وہ انہیں کہیں مل بھی سکے گی۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ اب واپس گھر چلنا ہی بہتر ہے۔ واپسی میں جب دونوں اس عقلمند آدمی کی جھونپڑی کے پاس پہنچے تو اُسے ساری باتیں سنائیں اور اس کو بُرا بھلا کہا کہ "ایسی چیز بتائی جس کا ملنا دنیا میں ممکن ہی نہیں ہے۔"

یہ سُن کر وہ آدمی مُسکرایا اور بولا "تم سمجھتے ہو کہ تمہارا سفر بے کار رہا۔ کیا

تمہیں اس سفر سے کوئی سبق حاصل نہیں ہُوا؟"

شہزادے نے کہا "ہاں! مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ سچی خوشی اور فراغت اس دنیا میں کہیں نہیں ہے۔"

اور شہزادی نے کہا "اور مَیں نے یہ سبق سیکھا کہ سچی خوشحالی اور فراغت اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ آدمی ہر حال میں خوش رہے۔"

عقل مند آدمی نے اُنہیں دعائیں دیتے ہوئے کہا "سچی خوشحالی اور فراغت کا تعویذ تو تمہارے دل میں ہے۔ اس کی حفاظت کرو۔ کوئی غم اور فکر تمہارے پاس نہ پھٹکے گا اور تم سدا خوش رہو گے۔"

۳۴

وائلن کا جادو

[مکسمبرگ کی یہ کہانی ڈبلیو جے ٹیلر وائٹ ہیڈ کی کتاب مکسمبرگ ۔ کہانیوں کی سرزمین سے لی گئی ہے ۔ یہ کتاب لندن کی کانسٹیبل اینڈ کمپنی نے ۱۹۵۱ء میں شائع کی

جادو کے دائمن ، نقارے یا بانسری جن کی آواز پر لوگ ناچتے ہیں ، یورپ ، ایشیا ، افریقہ اور امریکہ کی عوامی کہانیوں میں عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں ۔ اس میں ایک خاص مذہبی ناچ کو کہانی میں شامل کر دیا گیا ہے]

بہت دنوں کی بات ہے ایکٹرناش نامی شہر میں ایک آدمی رہتا تھا جس کا نام " ویٹ " تھا ۔ ویٹ ایک دفعہ اپنی بیوی کو لے کر مقدس مقامات کی سیر کو نکلا ۔ بعد میں اس کی بیوی مر گئی ۔

بیچارہ ویٹ اپنی بیوی کے غم میں روتا پیٹتا گھر لوٹ آیا ۔ اس کی بیوی کے بعض رشتہ دار پہلے ہی سے ویٹ کے دشمن تھے اور ان کی شادی کے خلاف تھے اب جو ویٹ واپس آیا تو انہیں دشمنی نکالنے اور ویٹ کی زمین اور دولت پر قبضہ جمانے کا موقع ملا ۔ انہوں نے عدالت میں ویٹ کے خلاف جھوٹی باتیں بیان کیں ۔

اور کہا کہ ویٹ نے سفر میں اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ بیچارے ویٹ کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ یہ سنتے ہی شہر کے سب لوگ اس میدان میں جمع ہو گئے۔ جہاں ویٹ کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ میدان کے بیچوں بیچ پھانسی کا تختہ لگا تھا اور چاروں طرف لوگ کھڑے تھے۔ مگر کسی کو بیچارے ویٹ سے ہمدردی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سب اس کی موت پر خوش ہیں۔ جب جلاد ویٹ کو لے کر میدان میں پہنچا۔ تو سب کے سب اُسے دیکھ کر ہنسنے اور قہقہے لگانے اور اُسے بُرا بھلا کہنے لگے، مگر ویٹ نے کسی کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ بالکل خاموش کھڑا سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا وائلن اس کے ہاتھ میں تھا۔

پھانسی کے تختے پر چڑھ کر اس نے مجمع کی طرف دیکھا تو ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں اور بلند ہو گئیں۔ کسی کی آنکھوں میں بھی رحم یا ہمدردی نظر نہ آتی تھی۔ نہ کسی نے اس کے لئے دُعا کی۔ ویٹ نے دیکھا کہ اس کی بیوی کے رشتہ دار تو ضرورت سے زیادہ خوش ہیں۔ وہ سب سے زیادہ چلا رہے تھے اور ویٹ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ ویٹ بے گناہ ہے مگر وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔

تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد ویٹ نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میدان میں خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ پوری توجہ سے ویٹ کی طرف دیکھنے لگے کہ اس کی آخری خواہش کیا ہو گی؟

ویٹ نے حاکم سے کہا: "میری آخری خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے ایک مرتبہ وائلن بجانے کی اجازت دیں۔"

یہ سن کر لوگ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے مگر ویٹ نے کوئی پروا نہ کی اُس کو اجازت مل گئی۔ اس نے اپنا وائلن ٹھوڑی کے نیچے دبا لیا اور بجانا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سناٹا چھاگیا۔ سارے میدان میں وائلن کی سریلی آواز گونج رہی تھی۔ اس میں بہت درد اور سوز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وائلن کی آواز خدا سے ویٹ کی مظلومی پر فریاد کر رہی ہو۔

تھوڑی دیر اسی طرح سناٹا چھایا رہا۔ پھر جلاد وائلن کی آواز پر ناچنے اور تھرکنے لگا جلاد کے بعد شہر کا امیر، پادری اور حاکم سب ہی ناچنے لگے اور رفتہ رفتہ سارا مجمع جس میں بچے، بوڑھے، عورتیں سب ہی شامل تھے۔ ناچنے لگے۔ سب لوگ اپنے ہاتھ نچا رہے اور پیر پٹخ رہے تھے۔ میدان کے بعد شہر اور پاس کے دیہات والوں کی باری آئی۔ ہر طرف سے لوگ ناچتے اور تھرکتے ہوئے آکر میدان میں جمع ہونے لگے اور پھر ناچتے ناچتے انھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ "ویٹ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔ وائلن بجانا بند کر دو۔ ورنہ ہم سب ناچتے ناچتے مر جائیں گے"۔ ویٹ کی بیوی کے وہ رشتہ دار بھی جنھوں نے اس کے خلاف جھوٹی گواہیاں دی تھیں چلانے لگے کہ "ہم نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ہمیں معاف کر دو۔ وائلن بجانا بند کرو۔ ہم تمھیں سزا سے بچالیں گے"۔

مگر ویٹ وائلن بجاتا رہا۔ لوگوں کی چیخوں سے سارا شہر گونج رہا تھا۔ مگر وائلن کی آواز سب سے اونچی تھی۔ اسی طرح سارا دن گزرا۔ شام ہونے لگی تو بوڑھے آدمی اتنے تھک گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اب مر جائیں گے۔ بچے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ شام ہوئی — سورج ڈوب گیا اور آسمان پر سرخی پھیل گئی۔ اب ویٹ پھانسی کے تختے پر سے اترا اور وائلن بجاتا ہوا آگے بڑھا۔ مجمع اس کے سامنے سے ہٹتا گیا۔ کسی کو ہمت نہ تھی کہ اسے ہاتھ بھی لگاتا اور وہ یونہی وائلن بجاتا شہر سے باہر نکل گیا اور دور پہاڑیوں میں غائب ہوگیا۔

ویٹ تو غائب ہوگیا۔ مگر اس کے وائلن کی آواز برابر گونجتی رہی اور لوگ ناچتے

رہے۔ پھر رات کے وقت ایک بڑا پادری اولی برارڈ وہاں پہنچا۔ اس نے لوگوں کو اس مصیبت میں دیکھا۔ تو سجدے میں گر پڑا اور خدا سے دعا کرنے لگا کہ خداوند! ان لوگوں پر رحم فرما اور انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا عطا کر "

اب دائلن کی آواز رفتہ رفتہ مدھم ہونے لگی اور غائب ہو گئی۔ لوگ تھک تھک کر گر پڑے۔ ویٹ کی بیوی کے رشتہ دار اب بھی ناچ رہے تھے۔ وہ سب یونہی ناچتے ناچتے مر گئے۔ دوسرے لوگ گرتے پڑتے اپنے اپنے گھروں کو پہنچے اور کئی دنوں تک سوتے رہے۔

ایکھٹر ناش کے لوگ یہ واقعہ کبھی نہ بھول سکے اور جس دن یہ واقعہ ہوا تھا ہر سال اسی دن ایک بڑا جلوس نکالتے رہے۔ اس جلوس کے سارے آدمی ناچتے اور تھرکتے ہوئے گرجا تک جاتے۔ یہ رسم آج بھی منائی جاتی ہے۔

۳۴

سینٹ کلاؤڈ کا پُل

[فرانس کی یہ کہانی فرانسیسی زبان کی پرانی کہانیوں کے مجموعے سے اخذ کی گئی ہے یہ مجموعہ آر ڈیون نے مرتب کیا اور ہوراٹزن ڈی فرانس۔ پیرس نے شائع کیا۔

شیطان کو دھوکہ دینے اور اس سے بھی زیادہ چالاکی دکھانے کے قصے یورپ میں بہت مشہور ہیں۔ بعض کہانیوں میں شیطان اس شرط پر کام کرتا ہے کہ اسے ایک بچہ دے دیا جائے گا اور جب وہ کام پورا کر دیتا ہے تو بچے کے ماں باپ اپنی چالاکی سے اسے دھوکہ دیتے ہیں۔ امریکہ کی ایک داستان میں بتایا گیا ہے۔ کہ شیطان ایک کسان سے شرط باندھ کر اس کی بیوی کو جیت لیتا ہے۔ مگر کسان کی بیوی شیطان کو اس قدر پریشان کر دیتی ہے کہ وہ تنگ آ کر کسان سے درخواست کرنے لگتا ہے کہ اپنی بیوی واپس لے لو۔]

فرانس میں دریائے سین کے کنارے ایک شہر ہے۔ سینٹ کلاؤڈ۔ اس شہر میں پہلے دریا پر کوئی پل نہ تھا جس سے لوگوں کو بہت تکلیف تھی۔ بڑی بحث تکرار کے بعد لوگوں نے پل بنانے کے لئے چندہ جمع کیا پل کا نقشہ تیار کیا گیا اور کام شروع ہو گیا۔ کام شروع کرنے کی خوشی اور جلدی میں لوگ اس کے لئے دعائیں مانگنا بھی بھول گئے۔ شاید یہی بات تھی

کر دن رات محنت کرنے کے بعد بھی پل تیار نہ ہو سکا۔ پل بنانے کے لیے دریا میں جو بانس لگائے جاتے وہ بہہ جاتے۔ صبح سے شام تک مزدور پتھر جماتے اور صبح آکر دیکھتے کہ پتھر بکھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح کام بگڑتا ہی گیا اور پل تیار نہ ہو سکا۔ بڑا مستری بہت پریشان تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ پریشان ہو گیا۔ ایک دن اس نے سارے نقشے اٹھا کر پھینک دیئے اور پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "اب یہ میرے بس کا کام نہیں"۔ "اسے شیطان ہی پورا کر سکے گا"۔ یہ کہہ کر وہ غصے سے پیر پٹختا چلا گیا

بڑے مستری کے چلے جانے کے بعد شہر کا امیر وہاں پہنچا۔ وہ بھی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اس نے دیکھا کہ پچھلے ہفتے سے لے کر اب تک پل بنانے کا کام ذرا بھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ حالانکہ مزدور دن رات لگے ہوئے ہیں۔ امیر کو بڑا افسوس ہوا اور وہ اسی سوچ اور فکر میں گھر کی طرف جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک لمبا اور کالا سا آدمی بھی چلنے لگا۔ مگر امیر اپنے خیالوں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے اس آدمی کے ساتھ ساتھ چلنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد خود اس آدمی نے بات شروع کی اور امیر سے کہا "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

امیر چونکا اور بولا "کس معاملے میں"

اجنبی نے کہا "پل کے معاملے میں"

امیر نے کہا "کہو کیا کہتا ہے۔ مگر جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں اس کے بعد تم سے یہ امید تو نہیں کہ کوئی اچھی بات سناؤ گے"

اجنبی نے کہا "دریا پر پل نہیں بن رہا ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

امیر نے کہا "یہ تو تم بھی جانتے ہو"

اجنبی نے کہا "ہاں! اور آپ جانتے ہیں کہ جب تک میں ہاتھ نہ لگاؤں یہ پل

نہ بن سکے گا"

"تو تم بھی کوئی مستری ہو" امیر نے پوچھا۔

اجنبی نے جواب دیا "یہ کام مستری کے کرنے کا نہیں ہے جناب میں شیطان ہوں اور آپ یقین مانیں کہ اگر میں چاہوں تو یہ پل جلد سے جلد بن جائے گا۔"

امیر یہ سن کر بڑا گھبرایا مگر اس نے اپنی گھبراہٹ کو ظاہر نہ ہونے دیا اور کہا "شیطان صاحب! آپ بالکل موقعے سے آگئے۔ یہ سامنے میرا گھر ہے۔ چلیئے اندر چل کر اطمینان سے بات کریں"

گھر پہنچ کر امیر نے اپنی بیوی سے کہا کہ "میں ایک آدمی سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو اور کسی کو میرے کمرے کی طرف نہ آنے دو"

امیر کی بیوی چلی گئی تو اس نے شیطان سے کہا "اب ہم کھل کر باتیں کریں گے۔ شہر کے لوگوں کے لیے یہ پل ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی تجارت اور کاروبار پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ مگر ہماری ساری کوشش کے باوجود یہ پل نہ بن سکا"

شیطان نے کہا "بڑے تعجب کی بات ہے"

امیر بولا "یہ پل بنانے کے لئے تم جو مانگو ہم دینے کو تیار ہیں۔ لوگ اس کے لئے نئے ٹیکس ادا کرنے کو بھی تیار ہو جائیں گے۔ اب تم بتاؤ کہ اس کام کا کتنا معاوضہ لو گے۔ تمہیں کتنا سونا دیا جائے"

شیطان نے مسکرا کر کہا "جناب سونا لے کر میں کیا کروں گا۔ میرے پاس سونے کی کیا کمی ہے۔ جتنا بھی چاہوں سونا بنا سکتا ہوں۔ یہ دیکھیے"

اتنا کہہ کر شیطان نے آتش دان میں ہاتھ ڈالا اور ایک بڑا دہکتا ہوا انگارا اٹھا

لیا۔ امیر یہ دیکھ کر ڈر گیا اور چلانے لگا " بس کرو! بس کرو! مجھے یہ شعبدے نہ دکھاؤ "

شیطان نے کہا " آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے " اور اس نے وہ دہکتا ہوا انگارہ جو خالص سونے کی ڈلی بن گیا تھا۔ امیر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور امیر سے کہا " یہ آپ رکھ لیں میرے لئے تو اس کی کوئی قیمت نہیں "

امیر نے کہا " مگر اصل بات تو ابھی طے نہیں ہوئی۔ سونے کی تمہارے لئے کوئی قیمت نہیں تو پھر تمہیں کیا چاہیئے "

شیطان نے کہا " آپ سچ کہتے ہیں۔ سونا میرے لئے بیکار ہے۔ مگر میں آپ کا پل بنا دیتا ہوں ایک شرط پر، پل بننے کے بعد سب سے پہلے جو زندہ چیز پل پر سے گزرے گی میری ہوگی "

امیر بڑا گھبرایا اور کہنے لگا " مگر ایسی شرط ماننے کا مجھے کیا اختیار حاصل ہے "

شیطان نے کہا " کیوں نہیں آپ کو اختیار ہے اور پھر یہ بھی تو سوچئے کہ کام کتنا بڑا ہے آگے آپ کی مرضی " یہ کہہ کر اٹھا اور جانے لگا۔

امیر نے کہا " مگر تم اس کو لے کر کیا کرو گے ؟ "

شیطان نے کہا " یہ میرا کام ہے آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میں اس کا کیا کروں گا " اب بھی وقت ہے۔ کاغذ اور قلم آپ کے سامنے ہے اٹھئے اور معاہدہ لکھ ڈالئے "

امیر نے قلم اٹھایا اور کہا " بتاؤ کیا لکھوں "

شیطان نے عہد نامہ لکھوایا۔ عہد نامے میں لکھا گیا کہ " شیطان چھ دن کے اندر اندر پل بنا دے گا۔ اس کے بدلے میں پل بننے کے بعد جو زندہ چیز سب سے پہلے پل پر سے گزرے گی وہ شیطان کی ہوگی " شیطان اور امیر دونوں نے کاغذ پر اپنے اپنے دستخط کئے اور شیطان وہ کاغذ لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ پل بڑی تیزی سے تیار ہو رہا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ امیر نے شیطان سے اپنے وعدے کی بات سب کو بتا دی اور سب کو خبردار کر دیا کہ پل بنتے ہی کوئی بھی اس پر سے پہلے گزرنے کی کوشش نہ کرے۔

چھ دن میں پل تیار ہو گیا۔ ساتویں دن شہر کے سب لوگ پل کے پاس جمع ہوئے مگر کوئی بھی پل پر جانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اچانک لوگوں کی نظریں پل پر پڑیں تو سب حیرت سے چیخ اٹھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شہر کا امیر بڑے اطمینان سے پل کی طرف جا رہا ہے۔

شیطان بھی پل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے امیر کو دیکھا تو کہا ،، اس کو کہتے ہیں سچی خدمت۔ مجھے معلوم ہے کہ جہنم میں ایسے امیر پہلے بھی بہت ہیں۔ مگر ایک اور سہی،، یہ کہہ کر اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھ پھیلا دیئے کہ امیر کو نزدیک آتے ہی پکڑ لے۔ مگر امیر نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ یونہی آگے بڑھتا گیا اور جب ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے پل شروع ہوتا تھا تو اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر زور سے ہلایا۔ امیر نے بڑی بڑی آستینوں کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہلا تو آستین میں سے ایک بلی نکل کر پل پر گری اور دوڑتی ہوئی پل کے اس پار پہنچ گئی۔

امیر نے پکار کر کہا ،، میاں شیطان! تمہاری شرط پوری ہو گئی۔ وہ دیکھو تمہاری مزدوری۔ دوڑو اس کے پیچھے ورنہ پھر ہاتھ نہ آئے گی،،

اس کے ساتھ ہی سارے شہر کے گرجا گھروں میں گھنٹے بجنے لگے اور پادری ایک جلوس کی شکل میں ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے خدا کی تعریف اور شکرانے گاتے پل کی طرف بڑھے۔

شیطان اپنی شکست پر دانت پیستا رہ گیا۔ مگر وہاں سے اسے بھاگنا ہی پڑا۔

۳۵

اسٹاورن کی خاتون

[یہ کہانی نیدرلینڈ کے ایک صوبے فریس لینڈ میں مشہور ہے۔ آلیو بیو پری لر کی کتاب "ہالینڈ کی کہانیاں" سے لی گئی ہے یہ کتاب شکاگو کے بک ہاؤس فار چلڈرن نے ۱۹۲۶ء میں شائع کی]

بہت دنوں کی بات ہے۔ اسٹاورن کا شہر فریس لینڈ کا سب سے بڑا شہر مانا جاتا تھا۔ اس زمانے میں فریس لینڈ نیدرلینڈ میں شامل نہیں تھا۔ اسٹاورن شہر ان دنوں شاندار محلوں، اونچے اونچے میناروں اور دولتمند لوگوں کا گھر تھا۔ اس کی شاندار عمارتوں اور عالیشان میناروں کو دیکھ کر زوئی ڈرزی کا گمان ہوتا تھا۔

اس شان و شوکت اور دولتمندی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اسٹاورن فریس لینڈ کی سب سے بڑی اور بہترین بندرگاہ تھی۔ یہاں سے جہاز مال و اسباب لیکر دنیا کے بڑے بڑے شہروں کو جاتے اور وہاں سے مال لاتے۔ تجارت کی وجہ سے وہاں کے لوگ اتنے مالدار ہو گئے تھے کہ وہ اپنے گھر کے دروازوں پر بھی سونے کی کنڈیاں اور قلابے لگاتے تھے۔ صرف یہی نہیں بہت سے لوگوں نے تو اپنے گھروں کے سامنے برآمدے میں سونے کا فرش بنوایا اور سونے کی جالیاں لگوائی تھیں۔ اپنی دولت پر ان لوگوں کو

بڑا غرور تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ اسٹاورن جیسا شہر سارے ہالینڈ میں کوئی نہیں، اور نہ ہالینڈ کے دوسرے شہروں میں ایسے دولتمند لوگ ہیں۔

اسی شہر میں ایک مالدار بیوہ خاتون رہتی تھی جو اسٹاورن کے سارے لوگوں سے زیادہ مغرور تھی اس کا شوہر کئی جہازوں کا مالک تھا۔ اور اتنی دولت چھوڑ گیا تھا کہ کسی کو اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ تھا۔ وہ جب بھی گھر سے نکلتی تو بہترین لباس اور ہیرے جواہرات پہن کر نکلتی اور اکڑ اکڑ کر چلتی۔ اس کی دولت کی وجہ سے سب ہی اس سے ڈرتے تھے۔ اسٹاورن میں رہنے والے بس دولت ہی کی فکر میں رہتے۔ ان کے نزدیک دولت ہی سب کچھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سب اس مالدار بیوہ کی بڑی عزت کرتے اور اس کی دولت کا ذکر کرتے رہتے۔

ایک دن اس خاتون کا ایک جہاز بہت سا قیمتی مال لے کر دور دراز ملکوں کو جانے لگا اس نے سوچا کہ "میں اپنے اس جہاز میں ایسی چیزیں منگواؤں گی کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں اور شہر والوں کو پتہ چل جائے کہ میرے مقابلے میں ان کی دولت کچھ بھی نہیں۔" یہ سوچ کر اس نے جہاز کے کپتان کو بلایا۔ کپتان بہت نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ خاتون نے اس سے کہا کہ "تم آتے وقت میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی اور بہترین چیز لیتا آنا روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ ساری دنیا میں ڈھونڈو اور کوئی نایاب چیز جہاں بھی اور جس قیمت پر ملے لے آؤ۔ اس کام کے لئے میں جہاز میں سونا رکھوا دیتی ہوں۔"

کپتان اس کا یہ حکم سن کر کچھ دیر تو سوچ میں پڑ گیا کہ آخر وہ کون سی چیز لا سکتا ہے۔ مگر وہ اپنی مالکن سے ڈرتا بھی تھا۔ اس لئے کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا بس اتنا ہی کہا کہ "میں آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔ اور آپ کے لئے دنیا کی سب سے قیمتی، سب سے خوبصورت اور بہترین چیز لیتا آؤں گا۔"

دوسرے دن جہاز اسٹاورن سے روانہ ہوا۔ سفر کے زمانے میں کپتان ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ آخر کون سی چیز مالکن کے لیے لے جائے۔ مشرق کے ملکوں میں اس نے سونے چاندی کے بہترین زیور، قیمتی ہیرے، جواہرات، اعلیٰ درجے کے قیمتی لباس اور بہت سے قیمتی سامان دیکھے۔ مگر کوئی چیز بھی اسے پسند نہ آئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ بیچارہ کپتان ایک سیدھا سادہ ایماندار آدمی تھا۔ وہ اسٹاورن کے شہریوں کی طرح دولت کا بھوکا نہ تھا۔ اس کی زندگی دیہات میں گزری تھی اس لیے اسے شاندار محلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی نظر میں قیمتی زیور، ہیرے جواہرات اور ایسی چیزیں بالکل بیکار تھیں۔

یہی بات تھی کہ اسے مشرق کے شہروں میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ مایوس ہو گیا کہ سب سے قیمتی، خوبصورت اور بہترین چیز کہیں نہ مل سکے گی۔ اور جب وہ اپنے جہاز میں واپس ہونے لگا تو راستے میں ڈانزگ کی بندرگاہ پر ٹھہرا۔ شہر میں گھومنے کیلئے نکلا تو ایک معمولی سی عمارت کے اندر اس کی نظر پڑی۔ وہاں سنہرے اور چمکدار گیہوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کپتان گیہوں کا ڈھیر دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سوچنے لگا کہ دنیا میں گیہوں سے بڑھ کر قیمتی، خوبصورت، اور بہترین چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ گیہوں سے روٹی بنتی ہے اور روٹی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ سونا چاندی، ہاتھی دانت اور جواہرات اس کے سامنے بے کار ہیں۔ میں بھی کتنا بیوقوف ہوں جو اتنے دنوں تک پریشان رہا کہ کون سی چیز خریدوں۔ یہ بات تو بچہ بھی بتا دے گا کہ گیہوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

یہ سوچ کر اس نے اسی وقت گیہوں خرید کر جہاز میں بھر لیے اور اسٹاورن کیطرف چلا۔ اسٹاورن میں وہ مالدار خاتون بڑی بے چینی سے اپنے جہاز کا انتظار

کر رہی تھی وہ رات دن یہی سوچتی رہتی کہ جب میرا جہاز وہ نایاب چیز لیکر آئے گا تو اسٹاورن کے لوگ حیران رہ جائیں گے"۔ وہ اپنے آپ سے کہتی "میرا جہاز نایاب چیز لیکر آئیگا تو پھر ہالبرٹ کبھی میرے سامنے غرور سے سر نہ اٹھا سکے گا اور گرگینا جب اس چیز کو دیکھے گا تو جل کر رہ جائیگا" ایسی باتیں وہ دوسروں کے سامنے بھی کہتی اور شیخی بگھارتی رہتی۔

جس دن اس کا جہاز اسٹاورن پہنچا تو سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ بچے بوڑھے سب بندرگاہ کی طرف دوڑے۔ سب یہ دیکھنے کو بے چین تھے کہ مالدار بیوہ کے جہاز میں کیا چیز آئی ہے۔ وہ خود بھی بن سنور کر بندرگاہ کی طرف گئی۔ بندرگاہ پر سب جمع تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

کوئی کہتا "بڑے بڑے ہیرے آئے ہوں گے کم از کم انڈے کے برابر"

دوسرا کہتا "نہیں بڑے بڑے زمرد ہوں گے یا لعل ہوں گے۔"

کپتان جہاز سے اترا تو مالدار بیوہ نے اس سے پوچھا "بھلا بتاؤ تو کیا لائے ہو میرے لئے"۔ کپتان نے کہا "دنیا کی سب سے بہتر چیز۔"

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور کہا "مگر بتاؤ تو آخر وہ ہے کیا؟"

کپتان نے کہا "گیہوں۔ سارا جہاز گیہوں سے بھرا ہوا ہے۔"

یہ سن کر وہ گھبرا گئی اور رُک رُک کر وہ بولی "گیہوں!! تم میرے لئے گیہوں لائے ہو!"

سب لوگ یہ سن کر ہنسنے اور مذاق اڑانے لگے وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے "بھلا یہ بھی کوئی خاص چیز ہے گیہوں لایا ہے کپتان"۔ اور پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

مالدار خاتون آج تک سب کے سامنے شیخی بگھارتی رہی تھی بڑے غرور سے کہتی تھی کہ میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی، خوبصورت اور نایاب چیز آنیوالی ہے۔ مگر آج لوگ اس کی ہنسی اڑا رہے

تھے۔ اسے بڑا غصہ آیا اور اس نے کپتان کو ڈانٹ کر کہا "میرے قیمتی سامان کے بدلے تم صرف گیہوں لے کر آئے ہو؟"

کپتان نے کہا "جی ہاں!"

بیوہ نے اسی غصے سے کہا "اس فضول چیز کو یہیں سمندر میں ڈال دو۔"

کپتان یہ سن کر بہت گھبرایا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اتنی قیمتی چیز سمندر میں کیوں ڈال دی جائے۔ وہ چلانے لگا "نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا گیہوں کو سمندر میں کیسے پھینکا جا سکتا ہے۔ خدا کے دیئے ہوئے رزق کی بے قدری بڑا گناہ ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے اگر آپ کو اس کی ضرورت نہیں تو یہ غریبوں میں بانٹ دیجئے ہزاروں بھوکوں کا پیٹ بھر جائیگا اگر آپنے اسے پھینک دیا تو بڑا گناہ ہوگا اس کے عذاب میں آپ غریب ہو جائیں گی آپ پر مصیبت آ جائے گی۔

کپتان کی یہ باتیں سن کر مالدار بیوہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے اپنی انگلی سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر سمندر میں پھینک دی اور کہنے لگی "جیسے یہ انگوٹھی واپس نہیں آ سکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ناممکن ہے کہ میں کبھی غریب ہو سکتی ہوں۔ مجھے نہ سزا کی پرواہ ہے نہ مصیبتوں کا ڈر میں جو کہتی ہوں وہی کرو اور گیہوں کو سمندر میں پھینک دو"

کپتان سخت رنجیدہ ہو کر پلٹا اور آہستہ آہستہ جہاز کی طرف جانے لگا بندرگاہ پر اتنے آدمی کھڑے تھے مگر کسی نے نہ کہا کہ گیہوں مت پھینکو کیونکہ سب دولت کے بھوکے تھے سونے چاندی کی قدر کرنیوالے۔ کسی کے دل میں گیہوں کی قدر نہ تھی سب کے سب اپنی شان اور دکھاوے کے عادی تھے جو کچھ کرتے صرف اپنی شان اور دولت دکھانے کیلئے کرتے تھے تاکہ دوسرے شہروں کے لوگ ان کے رعب میں آئیں مگر کپتان کو بڑا غم تھا اسنے گیہوں سمندر میں پھینکتے ہوئے طے کر لیا کہ اب وہ اس مغرور عورت کی نوکری نہیں کرے گا۔

ہر شخص مالدار خاتون کا مذاق اڑانے لگا اور وہ غصے میں بھری ہوئی اپنے گھر چلی گئی اس کے بعد جب وہ گھر سے باہر نکلتی تو بچے اس کا مذاق اڑاتے اور پوچھتے آپ کا دوسرا جہاز کب واپس آئیگا؟

دو دن بعد اس نے باورچی کو مچھلی پکانے کا حکم دیا، باورچی نے ایک مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے وہ انگوٹھی نکلی جو اس نے اس دن سمندر میں پھینکی تھی۔ باورچی دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا اور انگوٹھی اسے دیدی۔ مالدار خاتون نے انگوٹھی دیکھی تو ہیبت سے اس کا رنگ فق ہو گیا۔ انگوٹھی پھینکتے ہوئے اس نے جو غرور کی بات کہی تھی، اس کو یاد آگئی۔ مگر انگوٹھی واپس آگئی تھی۔ پھر اسی وقت خبر آئی کہ اس کا ایک جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا۔ اور ایک مہینے تک۔ ایسی ہی خبریں آتی رہیں۔

اگلے بہار کے موسم میں بندرگاہ پر گیہوں کے پودے اگ آئے، وہی گیہوں جن کو اسٹاورن کے لوگ بڑی حقیر چیز سمجھ رہے تھے ان پودوں میں گیہوں کی بالیں نہ آئیں۔ پودے کائی کی طرح پھیلتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ ان پودوں کی جڑوں میں ریت جمنے لگی یہ ریت جمتے جمتے ایک مضبوط اور بڑی دیوار بن گئی۔ اس کی وجہ سے اسٹاورن کی بندرگاہ بھی بند ہو گئی۔ کیونکہ ریت کی وجہ سے جہاز وہاں نہ آسکتے تھے۔ بندرگاہ کے بند ہوتے ہی اسٹاورن کی شان و شوکت بھی گھٹنے لگی شہر کے لوگ اپنے جہازوں پر مال بھیج کر دولت کماتے تھے۔ مگر اب وہاں جہاز ہی نہ آسکتے تھے چنانچہ ان کی دولت بھی ختم ہونے لگی۔ مالدار خاتون کے جہاز بھی بیکار ہو گئے۔ اس کی دولت بھی دوسرے شہروں کی طرح ختم ہو گئی اسٹاورن کے شاندار محل اجڑنے لگے اور چند سال بعد یہ شاندار شہر ایک معمولی سا گاؤں بن کر رہ گیا جس میں چند چھوٹے چھوٹے مکان تھے اور بس۔

اسٹاورن شہر تباہ ہو گیا مگر مالدار خاتون کے غرور کی کہانی سب کو یاد رہ گئی اور اسی کے نام پر ریت کی اس دیوار کا نام "خاتون کی ریت" مشہور ہو گیا۔

۳۶

شوربے کا پتھر

[بلجیم کی یہ کہانی میریا لیچ کی کتاب "شوربے کا پتھر" سے نقل کی گئی ہے۔ یہ کتاب فنک اینڈ وگینالس کمپنی نیویارک نے ۱۹۵۴ء میں شائع کی]

ایک سپاہی جنگ کے میدان سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ سردی کے دن تھے۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر بھورے بھورے بادل منڈلانے لگے۔ سپاہی کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک گاؤں میں پہنچا اور ایک گھر پر آواز دی "کیا آپ مجھے کھانا کھلا سکیں گے"؟ مگر اندر سے جواب آیا "بھائی ہمارے پاس اپنے ہی کھانے کو کچھ نہیں ہے"۔ سپاہی وہاں سے آگے بڑھا ایک اور گھر پر پہنچ کر وہی آواز لگائی، وہاں سے بھی وہی جواب ملا۔

اب سپاہی نے گھر والوں سے پوچھا "آپ کے پاس کوئی بڑی دیگ ہے"؟

"ہاں! ہاں! بڑی دیگ تو ہے"۔ گھر والوں نے جواب دیا۔

"اور پانی بھی ہے"۔ سپاہی نے پوچھا۔

"پانی بھی ہے"۔ جواب ملا۔

سپاہی نے کہا "دیگ میں پانی بھر کر اسے آگ پر رکھ دو۔ میرے پاس شوربے

کا ایک پتھر ہے۔"

گھر والوں نے تعجب سے پوچھا "شوربے کا پتھر؟ وہ کیا ہوتا ہے۔"

سپاہی نے کہا "یہ ایک پتھر ہوتا ہے جس سے شوربا بنتا ہے۔"

سارے گھر والے یہ عجیب و غریب پتھر دیکھنے کے لئے سپاہی کے پاس جمع ہو گئے۔ گھر کی عورتوں نے جلدی جلدی آگ جلائی اور دیگ میں پانی بھر کر اسے آگ پر رکھ دیا۔ سپاہی نے اپنی جیب سے ایک پتھر نکالا اور دیگ میں ڈال دیا۔ یہ ایک معمولی پتھر تھا جیسے راستوں پر عموماً پڑے ملتے ہیں۔ مگر اس گھر کے لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی انوکھا پتھر ہے۔ سپاہی نے پتھر دیگ میں ڈالنے کے بعد کہا "اب پانی پکنے دو۔"

سب پانی پکنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی نے کہا "آپ کے پاس تھوڑا سا نمک ہے؟"

"ہاں ہاں! نمک بہت ہے۔" یہ کہہ کر ایک عورت نے ایک ڈبہ سپاہی کے ہاتھ میں دیدیا۔ سپاہی نے ڈبے میں سے مٹھی بھر نمک نکال کر دیگ میں ڈال دیا۔

سپاہی کی نظر سامنے ایک تپائی پر پڑی جس کے نیچے گاجریں رکھی تھیں۔ اس نے کہا "اگر تھوڑی سی گاجریں مل جائیں تو شوربہ بہت مزیدار ہو جاتا۔"

یہ سن کر ایک عورت آگے بڑھی اور بہت سی گاجریں نکال لائی۔ سپاہی نے گاجریں صاف کر کے دیگ میں ڈال دیں اور گھر والوں کو جنگ کے قصے سنانے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "اگر کچھ آلو بھی ہوتے تو مزہ آجاتا۔"

"ہمارے باغ میں آلو ہیں۔" گھر والے کی بڑی لڑکی نے کہا اور دوڑتی ہوئی جا کر آلو لے آئی۔ سپاہی نے آلو بھی دیگ میں ڈال دیئے پھر کہنے لگا "پیاز سے شوربا خوشبودار ہو جاتا ہے۔" کسان نے اپنے چھوٹے لڑکے سے کہا "بیٹا دوڑ کر پڑوسی کے گھر جا اور تھوڑی سی پیاز مانگ لا۔" بچہ دوڑ کر پیاز لے آیا، وہ بھی دیگ میں ڈال دی گئی۔ پھر سپاہی نے کہا "میں نے ایک

زمانے سے گوبھی نہیں کھائی۔"

کسان کی بیوی نے اپنی لڑکی سے کہا "جاؤ باغ میں سے ایک گوبھی لے آؤ۔" سپاہی نے گوبھی دیگ میں ڈال دی۔ اور کہنے لگا "بس اب شوربہ تیار ہوا جاتا ہے۔ تم دیگ میں چمچہ چلاتے رہو۔" اور کسان کی بیوی ایک بڑا چمچہ دیگ میں چلانے لگی۔

اتنے میں کسان کا بڑا بیٹا گھر میں آیا۔ وہ اپنے ساتھ دو خرگوش شکار کر کے لایا تھا سپاہی نے خرگوش دیکھ کر کہا "بس اس کی کمی تھی۔"

کسان کے لڑکے نے پوچھا "کیا پک رہا ہے۔ بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔" کسان نے کہا "سپاہی شوربے کا پتھر لایا ہے۔ ہم اس کا شوربہ بنا رہے ہیں" سب نے مل کر جلدی جلدی خرگوش صاف کیے۔ اور ان کا گوشت بھی دیگ میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد شوربا تیار ہو گیا۔ سب مل کر کھانے کے لیے بیٹھے شوربا بہت ہی مزیدار تھا۔ سب مزے لے لے کر اور تعریفیں کر کر کے کھانے لگے۔

کسان نے کہا "بھئی بڑا مزیدار شوربا بنا ہے۔"

کسان کی بیوی نے کہا "بڑے کمال کا پتھر ہے یہ۔"

سپاہی نے کہا "اس پتھر سے آپ ہمیشہ ایسا شوربا بنا سکتی ہیں بس اس کی ترکیب یاد رکھیے۔"

سب کھا پی چکے تو سپاہی چلنے لگا اور اس نے وہ پتھر کسان کی بیوی کو تحفے کے طور پہ دے دیا۔ کسان کی بیوی نے پہلے تکلف کیا۔ مگر سپاہی نے کہا "لے لیجیے یہ کون سی بڑی چیز ہے۔"

اور سچ مچ یہ کوئی بڑی چیز ہی نہ تھی۔ سپاہی کسان کے گھر سے نکل کر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے راستے میں ویسا ہی اور پتھر مل گیا اور اس نے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا کہ کہیں اور کام آئیگا۔

۳۷

بادشاہ اور پادری

[انگلستان کی یہ کہانی ایک پرانی انگریزی نظم سے لی گئی ہے جو بشپ پرسی کی مرتب کی ہوئی کتاب "یادگاریں" سے لی گئی ہے۔ ایسی کہانیاں یورپ کے ملکوں میں بھی عام طور پر مشہور رہیں۔ مگر اس کہانی میں انگلستان کے بادشاہ کا ذکر ہے اور بادشاہ کے سوالوں کے جواب میں جو نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی انگلستان کے سکوں کے نام سے کیا جاتا ہے]

کسی زمانہ میں انگلستان پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام جان تھا۔ وہ بڑا ظالم اور حاسد تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سارے انگلستان میں اس کے سوا نہ کسی کے پاس دولت ہونی چاہیے اور نہ عزت۔ اسے کسی کے متعلق شبہ بھی ہو جاتا کہ لوگ اس کی عزت کرتے اور اس کی بات مانتے ہیں تو وہ اس پر بڑا ظلم کرتا۔

شاہ جان کو معلوم ہوا کہ کنٹربری کا لارڈ پادری بہت دولتمند ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک شاندار مکان بنایا ہے اور سو آدمی نوکر رکھے ہیں اور بڑا قیمتی سامان جمع کر لیا ہے۔ اس کے نوکر تک سونے کی پیٹیاں کمر سے باندھتے ہیں یہ سن کر جان کو بڑا غصہ آیا اور وہ پادری سے جل گیا۔ اس نے پادری کو بلایا اور کہا پادری صاحب

سُنا ہے کہ تمہارا گھر میرے محل سے بھی بڑا ہے۔ کیا یہ بات مناسب ہے؟"

پادری نے ادب سے کہا "حضور یہ سب جھوٹ ہے میں اتنا دولتمند نہیں ہوں سب جانتے ہیں۔ میں اپنی کمائی کے سِوا کسی کا ایک پیسہ بھی اپنے لئے خرچ نہیں کرتا۔"

شاہ جان نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں دوسروں کی دولت خرچ کرتا ہوں؟ جانتے ہو تم نے میری ہتک کی ہے اور اس گستاخی کی سزا موت ہے۔"

پادری نے گڑگڑا کر کہا "حضور! میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے میرے متعلق جھوٹی باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔"

مگر جان نے غصّہ سے کہا "پھر بھی تمہاری گفتگو کا انداز مجھے پسند نہیں، تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔ مگر میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ اگر تم میرے تین سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دے سکے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔"

بیچارہ پادری کر بھی کیا سکتا تھا۔ کہنے لگا "حضور کوشش کروں گا۔"

جان نے کہا "پہلا سوال یہ ہے کہ میری کیا قیمت ہے؟ ایک ایک پائی کا کر کے بتانا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر میں گھوڑے پر بیٹھ کر ساری دنیا کا چکّر لگاؤں تو کم از کم کتنا وقت لگے گا اور تیسرا سوال یہ ہے کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

پادری ان میں سے ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکتا تھا۔ اس نے بڑی عاجزی سے گڑگڑا کر تین ہفتے کی مہلت مانگی، جان نے مہلت دیدی، پادری آکسفورڈ گیا جہاں بڑی یونیورسٹی ہے اور بڑے بڑے قابل لوگ رہتے ہیں۔ مگر کوئی بھی جان کے سوالوں کا جواب نہ بتا سکا۔ پادری اس طرح پھرتا رہا۔ مگر کہیں بھی اسے ایسا آدمی نہ مِل سکا جو ان سوالوں کے جواب دے سکے۔ تین ہفتے کی مہلت ختم ہونے میں اب چند ہی دن رہ گئے تھے۔ پادری زندگی سے مایوس ہو گیا اور بہت غمگین ہو کر اپنے گھر آنے لگا جب وہ

گھر واپس ہو رہا تھا تو راستے میں اسے چرواہا ملا، جو اس کے جانور چراتا تھا۔ چرواہے نے پادری کو دیکھا تو ادب سے سلام کیا اور کہا "حضور دربار کی کیا خبر ہے؟"

"بڑی خبر ہے۔" پادری نے کہا۔ "میری زندگی کے صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں اگر میں ان تین دنوں میں بادشاہ کے سوالوں کے جواب نہ سوچ سکا تو مار ڈالا جاؤں گا۔"

چرواہے نے پوچھا "وہ کیا سوال ہیں؟"

پادری نے اسے بادشاہ کے تینوں سوال بتائے۔ چرواہے نے کہا "حضور آپ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ نے سنا نہیں کہ کبھی کبھی بیوقوف آدمی بھی عقل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ آپ مجھے اپنا گھوڑا اپنا لباس اور چار نوکر دیجئے۔ میں آپ کا بھیس بدل کر بادشاہ کے پاس جاؤں گا۔ اور سوالوں کے جواب دوں گا۔"

پادری کو یہ بات پسند نہ آئی کہ ایک جاہل چرواہا اُس کا بھیس بدلے۔ اس نے سوچا کہ جن سوالوں کا جواب وہ خود نہ دے سکا اگر ایک چرواہا دے گا تو کتنی شرم کی بات ہوگی، مگر مجبوری تھی۔ وہ چرواہے کی بات پر رضامند ہو گیا۔ اس نے چرواہے کو اپنے کپڑے، گھوڑا کچھ روپے اور نوکر دے دیئے۔ اور خود گھر چلا گیا۔

چرواہا پادری کا بھیس بدل کر شہر پہنچا اور دربار میں حاضر ہوا۔ جان نے اسے پادری ہی سمجھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی بے رخی سے پیش آیا اور کہا۔ "کل تمہیں دربار میں سب کے سامنے میرے سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔ اگر تم نے ٹھیک ٹھیک جواب دیئے تو تمہیں آزاد کر دوں گا اگر تم جواب نہ دے سکے تو قتل کرا دوں گا۔"

دوسرے دن دربار آراستہ ہوا۔ سب امیر جمع ہو گئے تو چرواہے کو پیش کیا گیا جو پادری کا بھیس بدلے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر جلا دسیاہ لباس پہنے کھڑا تھا۔ جان بھی چرواہے کو پادری ہی سمجھ رہا تھا۔ چرواہے نے جھک کر سلام کیا اور کہا "حضور

میں حاضر ہوں"

جان نے کہا "اچھا! میرے پہلے سوال کا جواب دو اور بتاؤ کہ میری ٹھیک ٹھیک کیا قیمت ہے؟"

چرواہے نے کہا حضور اس کا جواب تو بہت آسان ہے. ہمارے ملک میں جو سکہ "ساورن" چلتا ہے اس میں بیس شلنگ ہوتے ہیں اور جو سکہ کراؤن کہلاتا ہے اسمیں پانچ شلنگ ہوتے ہیں. اگر ساورن میں سے ایک کراؤن کم کر دیا جائے تو پندرہ شلنگ بچتے ہیں. مگر آپکے سر پہ تاج بھی ہے. اس لئے آپ کی قیمت ایک ساورن اور ایک کراؤن کے برابر ہوئی یعنی پچیس شلنگ۔"

دراصل انگریزی میں ساورن بادشاہ کو کہتے ہیں۔ اور کراؤن تاج کو. اس کے علاوہ ساورن اور کراؤن سکوں کے نام بھی ہیں. یہاں ان لفظوں کے انہی دو معنوں سے چرواہے نے یہ بات نکالی۔

جان یہ سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ میری قیمت اتنی کم ہے مگر خیر تم نے حساب بالکل ٹھیک کیا ہے. اس لئے تمہارا یہ جواب قبول کیا جاتا ہے اب دوسرے سوال کا جواب دو اور بتاؤ کہ اگر میں گھوڑے پر سوار ہو کر ساری دنیا کا چکر لگاؤں تو کتنا وقت لگے گا؟"

چرواہے نے کہا "حضور یہ بھی بہت آسان بات ہے. جس وقت سورج نکلے آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور سورج کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں. مگر آپ کی رفتار سورج سے کبھی بڑھے نہیں اور گھٹے بھی نہیں. اس طرح آپ چوبیس گھنٹوں میں ساری دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں۔"

جان یہ سن کر پھر ہنسنے لگا اور بولا "سچ کہتے ہو. دنیا کا چکر لگانے کی یہی ایک

صورت ہے. مگر اب تیسرا اور سب سے مشکل سوال آتا ہے۔ بتاؤ کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔"

چرواہے نے کہا "حضور یہ تو سب سے آسان سوال ہے. آپ سوچ رہے ہیں، میں کنٹربری کا بڑا پادری ہوں. مگر میں دراصل ایک غریب چرواہا اور پادری کا نوکر ہوں اور حضور سے درخواست کرتا ہوں کہ پادری کی جان بخشی کی جائے۔"

یہ کہہ کر چرواہے نے پادری کے کپڑے اتار ڈالے. یہ تماشا دیکھ کر دربار کے سارے امیر قہقہے لگانے لگے. شاہ جان کو پہلے تو بہت غصہ آیا کہ ایک چرواہے نے اسے بیوقوف بنا دیا. مگر پھر وہ ہنسنے لگا۔ آخر اس نے خوش ہو کر پادری کو معاف کر دیا اور چرواہے کو انعام دے کر رخصت کیا۔

---

(۳۸)

بگُولا

[یہ آئس لینڈ کی ایک عوامی کہانی ہے۔ ایسی کہانیاں جس میں کوئی شخص اپنا پیچھا کرنے والوں کے راستے میں جادو کے زور سے رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے اکثر ملکوں میں عام ہیں۔ افریقہ میں اس قسم کی کہانیوں میں لوگ راستے میں انڈے پھینکتے اور انڈوں کو جادو سے پہاڑ، دریا اور ایسی ہی دوسری رکاوٹوں میں بدل دیتے ہیں]

پرانے زمانے کا ذکر ہے ایک گاؤں میں ایک کسان اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ وہ سب ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اُن کے پاس صرف ایک گائے تھی جس کا نام بگُولا تھا۔

گائے نے ایک بچھڑا دیا۔ کسان کی بیوی گائے کے پاس بیٹھی اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی اور جب بچھڑا پیدا ہو گیا تو وہ گائے کے پاس سے اُٹھ کر گھر کے کام کاج کے لیے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر گائے کو دیکھنے گئی تو گائے غائب تھی۔ کسان اور اس کی بیوی نے بہتیرا ڈھونڈا مگر گائے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ گائے کے اس طرح غائب ہو جانے سے دونوں بہت پریشان تھے۔ اسی پریشانی اور غصے میں

انہوں نے اپنے بیٹے کو گائے کی تلاش میں بھیجا اور اس سے کہہ دیا کہ جب تک گائے کا پتہ نہ چلے تو بھی واپس نہ آنا۔ بیٹے کو کسان کی بیوی نے نئے جوتے پہنائے اور اسکے سامنے کچھ کھانے پینے کو دیا۔ لڑکا گائے کی تلاش میں نکل پڑا۔

کسان کا بیٹا چلتے چلتے ایک جگہ روٹی کھانے کو بیٹھا اور پکارنے لگا "بگولا! اگر تو زندہ ہے تو آواز دے"۔ یہ کہتے ہی اسے بڑی دور سے گائے کی آواز آئی۔

کسان کا بیٹا آواز کے رُخ پر چل دیا۔ بہت دُور جانے کے بعد تھک کر پھر روٹی کھانے بیٹھا اور اس نے پھر کہا "بگولا! اگر تو زندہ ہے تو آواز دے۔" اسے پھر دُور سے گائے کی آواز آئی اور وہ پھر چل پڑا۔ آخر چلتے چلتے ایک بڑے پہاڑ پر پہنچ گیا۔ وہاں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ اور پھر گائے کو پکار کر کہا۔ "بگولا! اگر تو زندہ ہے تو آواز دے"

اب اسے گائے کی آواز پہاڑ کے بالکل نیچے کی طرف سے آئی۔ وہ پہاڑ سے نیچے اترا۔ وہاں ایک بڑا غار تھا۔ کسان کا بیٹا غار کے اندر گیا۔ وہاں بگولا ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ کسان کے بیٹے نے اسے کھول لیا اور غار سے نکال کر گھر کی طرف چل پڑا۔

کسان کا بیٹا گائے کو لے کر تھوڑی دور گیا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑی بھوتنی کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا بھوت بھی تھا۔ بھوتنی لمبے لمبے ڈگ بھرتی، اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ کسان کا بیٹا اسے دیکھ کر ڈر گیا اور سوچنے لگا کہ "یہ بھوتنی تو ابھی مجھے پکڑ کے مار ڈالیگی۔ اس نے گائے سے پوچھا "بگولا! اب ہم کیا کریں؟"

گائے نے کہا "میری دم سے ایک بال لیکر زمین پر ڈال دو۔"

کسان کے بیٹے نے گائے کی دُم سے ایک بال لیکر زمین پر ڈال دیا تو بگولا نے اس بال سے کہا "میرے حکم سے تو ایک ایسا بڑا دریا بن جا جسے پرندوں کے سوا کوئی پار نہ کرسکے"

گائے کا یہ کہنا تھا کہ وہ بال ایک بہت ہی لمبا چوڑا اور گہرا دریا بن گیا۔ بھوتنی دریا کے کنارے پہنچ کر رُک گئی اور اپنے بیٹے سے بولی: "یوں کام نہ چلے گا تو دوڑ کر گھر جا اور میرے باپ کے بڑے بیل کو لے آ۔"

یہ سنتے ہی وہ چھوٹا بھوت بھاگا ہُوا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک بہت ہی بڑے بیل کو لے آیا۔ بیل نے آتے ہی دریا کا سارا پانی پی لیا۔ اور بھوتنی اپنے بیٹے کو لے آگے بڑھنے لگی کسان کے بیٹے نے پلٹ کر دیکھا تو بھوتنی تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی، اسے ڈر ہُوا کہ یہ بہت جلد اسے آ لے گی۔ اس نے پھر گائے سے کہا "بگولا! اب ہم کیا کریں؟"

گائے نے کہا "میری دم سے ایک بال لیکر زمین پر ڈال دو۔"

کسان کے بیٹے نے گائے کی دم سے ایک بال نکالا اور زمین پر ڈال دیا۔ گائے نے بال سے کہا "میرے حکم سے ایسی آگ بن جا کہ سوائے پرندوں کے کوئی تجھ پر سے گزر سکے۔"

گائے کے یہ کہتے ہی اس جگہ زبردست آگ دہکنے لگی۔ بھوتنی جب وہاں پہنچی تو رُک گئی۔ اور اپنے بیٹے سے کہنے لگی: "یوں کام نہ چلے گا۔ تو دوڑ کر گھر جا اور میرے باپ کے بڑے بیل کو لے آ۔"

یہ سنتے ہی چھوٹا بھوت وہاں سے بھاگا اور تھوڑی ہی دیر میں اس بیل کو لے آیا۔ بیل نے وہ سارا پانی آگ پر اگل دیا، جو اس نے پیا تھا۔ اور فوراً آگ بجھ گئی۔ بھوتنی پھر کسان کے بیٹے کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھی، جب وہ زیادہ نزدیک پہنچ گئی۔ تو کسان کے بیٹے نے گائے سے کہا "بگولا! اب ہم کیا کریں؟"

گائے نے پھر کہا "میری دم کا ایک بال لیکر زمین پر ڈال دو۔"

کسان کے بیٹے نے اس کی دم سے ایک بال لیکر زمین پر ڈال دیا۔ اب گھنے نے

اس بالی کو ایک بہت ہی اونچے پہاڑ میں بدل دیا۔ بھوتنی جب اس پہاڑ کے پاس پہنچی تو اپنے بیٹے سے کہا "یوں کام نہ چلے گا تو دوڑ کر گھر جا اور میرے باپ کا بڑا برچھا لے آ۔" چھوٹا بھوت بھاگا ہوا گیا اور ایک بڑا سا برچھا لے آیا۔ بھوتنی نے اس برچھے سے پہاڑ میں ایک بڑی سُرنگ بنا دی۔ اور اس میں سے دیکھا تو اسے کسان کا بیٹا نظر آیا۔ وہ سرنگ میں گھس پڑی کہ جلدی سے کسان کے بیٹے کو جا پکڑے۔ گر جلدی میں اس نے یہ خیال نہ کیا کہ سرنگ ابھی اتنی چوڑی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اسی میں پھنس گئی اور پھر خود بھی پتھر بن گئی۔

کسان کا بیٹا بگُولا کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ اُسے دیکھ کر کسان اور اس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ اور سب آرام چین سے رہنے لگے۔

اَمریکہ



(۳۹)

ہرن اور باگھ نے گھر بنایا

[یہ کہانی نیو یارک پبلک لائبریری کے ایک مسودہ سے لی گئی ہے جس کے موئف کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس کہانی میں عجیب و غریب قسم کی دلچسپ کیفیت پائی جاتی ہے جو دنیا بھر میں مانی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس میں قصہ کی ممتاز شخصیتیں یکساں طور پر حالات کے تحت پریشانی میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ باگھ اور ہرن دونوں کیوں ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے اور یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ایک جانور اپنے ہمجنس کو پھاڑ کھانا پسند نہیں کرتا۔]

کسی جنگل میں ایک ہرن رہتا تھا۔ جنگل میں اسے کھانے پینے، کھیلنے کودنے سیر کرنے کے سب سامان مل جاتے بس ایک چیز کی کمی تھی۔ ہرن کا اپنا کوئی گھر نہ تھا، وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ کہیں ایک چھوٹا سا گھر اپنے لئے بنالے۔ مگر گھر بنانے کے لئے کوئی اچھی جگہ اسے کہیں نظر نہ آتی تھی۔ ایکدن گھومتے گھماتے ہرن جنگل میں دور تک چلا گیا۔ دم لینے کو ذرا ٹھہرا تو دیکھا کہ تھوڑی ہی دور ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی ہے ندی کے کنارے خوبصورت ہرے بھرے درخت پھلوں سے لدے کھڑے ہیں ہرن

کہ یہ جگہ بڑی پسند آئی اور اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ یہیں گھر بنائے گا پہلے تو اس نے سوچا کہ اسی وقت کام شروع کر دے۔ مگر پھر خیال آیا کہ شام ہونے میں تھوڑی ہی دیر ہے رات ہو گئی تو واپس کیسے جاؤں گا کل صبح ہی آ جاؤں گا۔ اور کام شروع کر دوں گا یہ سوچ کر ہرن وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک باگھ کہیں سے گھومتا پھرتا وہاں آ پہنچا۔ اسے بھی اپنے لئے ایک گھر بنانے کی فکر تھی۔ اور اتفاق کی بات اس کو بھی وہی جگہ پسند آئی جو ہرن نے گھر بنانے کیلئے چنی تھی۔ باگھ نے بھی دوسرے دن صبح سویرے آ کر کام شروع کرنے کا ارادہ کر لیا اور چلا گیا۔

دوسرے دن ہرن صبح ہی صبح وہاں پہنچا۔ دن بھر اس نے خوب کام کیا۔ زمین صاف کی۔ پتھر اور پودے نکال کر پھینکے اور جب بالکل تھک گیا تو وہاں سے چلا آیا۔ اس دن ہرن نے اتنا کام کیا تھا کہ تھکن کے مارے دوسرے دن وہاں جانے کی ہمت ہی نہ پڑی مگر باگھ وہاں پہنچ گیا۔ باگھ نے جو دیکھا کہ زمین بالکل صاف اور مکان بنانے کیلئے بالکل تیار ہے تو بہت خوش ہوا سوچا کہ ضرور دیوتا نیوپن میری مدد کی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں دیوتا نیوپن کا شکریہ ادا کر کے کام شروع کر دیا اور شام تک دو دیواریں بنا ڈالیں۔

اب اتفاق کی بات کہ دوسرے دن باگھ تھکن کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا اور ہرن جا پہنچا۔ دیواریں کھڑی دیکھ کر ہرن نے بھی یہی سوچا کہ ہو نہ ہو دیوتا نیوپن میری مدد کر رہا ہے وہ بھی دل ہی دل میں دیوتا کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ اسی طرح ایک دن ہرن کام کرتا اور ایک دن باگھ اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ آخر دو کمروں کا اچھا سا مکان تیار ہو گیا۔

جب مکان بن کر تیار ہو گیا۔ تو شام کے وقت ہرن پہنچا اور ایک کمرے میں سو گیا تھوڑی دیر بعد باگھ آیا اور وہ دوسرے کمرے میں سو گیا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں یہی سمجھتے رہے کہ دوسرے کمرے میں وہ دیوتا سو رہا ہے جس نے گھر بنانے میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔

صبح اٹھے اور اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلے تو ہرن اور باگھ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

باگھ نے ہرن سے پوچھا "تم نے گھر بنانے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا؟"

اور ہرن نے کہا۔" اور تم نے گھر بنانے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا؟"

جب دونوں کو پتہ چلا کہ گھر بنانے میں کس نے کس کی مدد کی تھی تو دونوں نے یہی طے کیا کہ اب ہم اس گھر میں مل کر ہی رہیں گے۔ بس اسی دن سے ہرن اور باگھ مل جل کر رہنے لگے۔

ایک دن باگھ نے ہرن سے کہا آج تم گھر پر ہی رہو اور پکوان کا سامان تیار رکھو میں شکار کر کے لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر باگھ تو جنگل میں چلا گیا۔ اور ہرن پکوان کی تیاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد باگھ ایک ہرن مار لایا یہ دیکھ کر ہرن بہت گھبرایا اور سوچنے لگا کہ اگر باگھ اس طرح ہرن کا ہی شکار کرتا ہے۔ تو ایک دن میری بھی شامت آئے گی۔ باگھ نے خود بیٹھ کر کھانا پکایا۔ اور جب کھانا تیار ہو گیا تو ہرن سے کہا "آؤ کھانا کھائیں۔ مگر ہرن بھلا کیسے کھا سکتا تھا۔ باگھ اکیلا ہی سب چٹ کر گیا اور مزے سے سو گیا۔ مگر ہرن کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ باگھ کے ساتھ کیسے گزر ہو سکے گی سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی اور ہرن خوشی سے اچھل پڑا۔ اب وہ بڑی بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا صبح ہوئی تو اس نے باگھ سے کہا "آج تم پکوان کا سامان تیار کر دو میں شکار کر کے لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جنگل میں نکل گیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک باگھ دکھائی دیا جو مزے سے ایک پیڑ کے نیچے سو رہا تھا۔ اسی جنگل میں ایک مور خور کی طرح کا بہت خوفناک درندہ ٹنڈوا بھی رہتا تھا۔ ہرن سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور کہا "میں آپ کے پاس ایک باگھ کی شکایت لے کر آیا ہوں، وہ ہمیشہ آپ کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ ابھی جب میں ادھر آرہا تھا تو اس نے مجھے روک کر آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا

میں نے کہا کہ تمہیں جنگل کے بادشاہ کی شان میں ایسی گستاخی کرنے کی ہمت کیسے ہوئی تو کہنے لگا جنگل کا بادشاہ تو میں ہوں۔" بس یہ سننا تھا کہ ٹنڈوا مارے غصے کے کانپنے لگا اور گرج کر بولا "کہاں ہے وہ بدتمیز باگھ؟" ہرن نے کہا "آپ میرے ساتھ چلیں" اور ٹنڈوا کو ساتھ لیکر اس درخت کے پاس پہنچا جہاں باگھ سو رہا تھا۔ ٹنڈوا رینگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ایک ہی جست میں اسے جا لیا اور ایسا پنجہ مارا کہ باگھ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ باگھ کو مار کر ٹنڈوا وہاں سے چلا گیا تو ہرن بڑی مشکل سے اسے گھسیٹتا گھسیٹتا اپنے گھر لے آیا۔ باگھ نے جو دیکھا کہ ہرن ایک باگھ مار لایا ہے تو ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ ہرن نے بڑے اطمینان سے بیٹھ کر کھانا پکایا اور جب کھانا تیار ہوا تو باگھ کو بلایا کہ "آؤ کھانا کھائیں" مگر باگھ جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ رات ہوئی تو دونوں اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مگر نیند کسی کو نہ آئی۔ ہرن کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب باگھ میرے کمرے میں گھس آئے اور میرا کام تمام کر دے اور ادھر باگھ سہما ہوا تھا کہ کب ہرن آ کر اس پر حملہ کر دے۔ دونوں اپنے اپنے کمروں میں ڈرے ہوئے بیٹھے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہرن کی آنکھ لگ گئی۔ نیند میں اس کا سر بہت زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ باگھ تو جاگ رہا تھا۔ اس نے جو آواز سنی تو سمجھا کہ ہرن اس کے کمرے میں گھس آیا ہے۔ وہ مارے ڈر کے چیخ پڑا۔ ہرن نے باگھ کی چیخ سنی تو سمجھا کہ باگھ مجھ پر حملہ کرنے آگیا ہے اور لگا اور بھی چلانے۔ غرض دونوں اسی طرح چیختے چلاتے اپنے کمروں سے نکلے اور لگے جنگل کی طرف بھاگنے۔ باگھ ایک طرف کو بھاگنے لگا تو ہرن دوسری طرف کو۔ اس دن سے باگھ اور ہرن ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔

---

(۴۰)

رات کی چڑیا

[یہ کہانی ارجنٹائن کے علاقہ میں روایتی داستان کی طرح مشہور چلی آتی ہے]

امریکہ کے جنگلوں میں ہماری کوئل کی طرح کا ایک پرندہ ہوتا ہے جسے کاکوی کہتے ہیں۔ یہ پرندہ دن کو درختوں میں چھپا رہتا ہے مگر راتوں کو اُڑتا پھرتا اور پکارتا رہتا ہے۔ جب وہ پکارتا ہوتا ہے تو ایسی آواز آتی ہے جیسے کوئی لڑکی "بھیّا بھیّا" چیخ رہی ہو۔ اس پرندے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ امریکا کے کسی جنگل کے پاس ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا جس میں ایک بھائی اور ایک بہن رہتے تھے۔ اُن کا اور کوئی نہ تھا۔ بھائی بہن کو بہت چاہتا تھا اور ہر وقت اُسے خوش کرنے کی فکر میں لگا رہتا۔ وہ دن دن بھر جنگل میں گھوم کر پھل پھول جمع کرتا، کبھی جھیل پر جا کر مچھلیاں پکڑتا اور لا کر بہن کو دیتا۔ مگر اس کی بہن تھی بڑی بدمزاج۔ وہ کسی چیز سے خوش ہوتی ہی نہ تھی۔ بھائی جو بھی لا کر دیتا، اُسے یوں ناک بھوں چڑھا کر لیتی گویا اُلٹا اسی پر احسان کر رہی ہے۔ اور تو اور وہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی۔ بیچارہ دن بھر کا تھکا ہُوا شام کو گھر آتا۔ تو اس سے لڑائی جھگڑا کرنے لگتی۔ کبھی وہ بہت ہی تھکا ہُوا گھر آتا اور پانی مانگتا تو یہ پیالہ بھر کر لاتی۔ مگر

جب بھائی پیالہ لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو سارا پانی زمین پر پھینک دیتی اور قہقہے لگاتی۔

بھائی اپنی بہن کی ان باتوں کا کبھی بُرا نہ مانتا۔ بلکہ دوسرے دن کوئی اچھی چیز بہن کے لئے ڈھونڈنے لگتا۔ وہ یہی سوچتا کہ میں جو چیزیں لاتا ہوں۔ وہ میری بہن کو پسند نہیں آتیں۔ اس لئے اُسے مجھ پر غصّہ آتا ہے۔ اگر میں کوئی ایسی چیز لے آؤں جو اُسے پسند آجائے تو ضرور وہ خوش ہو گی۔ اسی فکر میں وہ ایک دن جنگل میں بہت دور نکل گیا ایک اونچے درخت پر اُسے شہد کا چھتّا نظر آیا۔ شہد کا چھتا دیکھتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور کہنے لگا۔ آج تو میری بہن بہت خوش ہو گی اور شہد کا چھتّا نکالنے کے لئے درخت پر چڑھنے لگا۔ درخت کانٹوں سے بھرا ہُوا تھا۔ اس کا سارا بدن لہولہان ہو گیا اور کپڑے پھٹ گئے۔ مگر بہن کو خوش کرنے کی دھن میں اس نے کوئی پروا نہ کی۔ چھتّے کو ہاتھ لگایا تو شہد کی مکھیاں اُسے لپٹ گئیں۔ مگر اس نے چھتّا اتار ہی لیا اور ہانپتا کانپتا درد سے کراہتا اور زخموں سے چُور گھر پہنچا۔ مگر اس کی بہن کو نہ بھائی کی حالت پر رحم آیا اور نہ شہد کا چھتّا دیکھ کر کوئی خوشی ہوئی۔ اُلٹا وہ اس سے جھگڑنے لگی۔ بھائی نے زخم دھونے اور پینے کے لئے پانی مانگا تو اس نے ہمیشہ کی طرح اس کا مذاق اڑایا۔ اور اُسے دکھا دکھا کر سارا پانی پھینک دیا۔

بھائی کو بہن کے اس سلوک سے بڑا دُکھ ہُوا۔ وہ رات بھر درد سے تڑپتا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر میری بہن ایسا کیوں کرتی ہے۔ صبح ہوئی تو اس نے اٹھ کر پہلے تو جھونپڑی کے اندر کا حال خوب غور سے دیکھا اور پھر باہر اس چھوٹے سے باغیچے کو دیکھا جسے اس نے بڑی محنت سے لگایا تھا۔ جھونپڑی کے اندر ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ اسے ہر طرف گندگی نظر آئی۔ باغیچے کے سارے پودے سوکھ گئے تھے۔ اب اُسے پتہ چلا کہ اس کی بہن کتنی بے پروا اور غافل ہے۔ نہ گھر کی صفائی کرتی ہے اور نہ باغیچے میں پودوں کو پانی دیتی ہے

یہ سب دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ دراصل اس کی بہن بڑی خود غرض ہے۔ اسے اپنے سوا کسی کی فکر نہیں۔ ان باتوں سے اُسے بڑا دکھ ہوا۔ وہ رنجیدہ ہو کر جنگل کی طرف چلا گیا چلتے چلتے اس نے سوچا کہ آخر کب تک وہ اپنی بہن کی خود غرضی برداشت کرے گا۔ اس نے اُسے سزا دینے کی ٹھان لی۔ ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی اور وہ سیدھا گھر جا پہنچا۔ بہن سے کہنے لگا کہ آج جنگل میں ایک درخت پر میں نے ایسا خوبصورت اور مزیدار پھل دیکھا ہے کہ بس کیا کہوں تم دیکھو تو مارے خوشی کے لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔ بہن تو تھی ہی خود غرض۔ اُسے ہمیشہ اپنی خوشی کی فکر رہتی تھی۔ یہ سن کر بھائی سے لڑنے لگی کہ تم وہ پھل میرے لیے کیوں نہ لے آئے۔ بھائی نے کہا تمہیں بھی ساتھ چلنا ہو گا۔ ورنہ تم اس کی خوب صورتی کا اندازہ نہ کر سکو گی۔

بہن فوراً ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ بھائی بہن کو لے کر چلا۔ وہ جنگل میں جب بہت دور چلے گئے تو ایک اونچے درخت کے پاس پہنچ کر اس نے کہا۔ اس درخت کے اوپر ہے وہ پھل بہن نے اوپر کی طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگی "مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔" بھائی نے کہا "یوں نہیں نظر آئے گا پہلے اوپر چڑھو۔" بہن پھل کی دھن میں بہت تیزی سے درخت پر چڑھنے لگی۔ وہ آدمی سے زیادہ بلندی تک پہنچ گئی۔ مگر نہ کوئی پھل نظر آیا نہ پھول۔ وہ لگی بھائی پر غصے ہونے۔ بھائی نے جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا پکار کر کہا کہ پھل تو درخت کی چوٹی پر ہے ابھی کیسے نظر آئے گا۔ بہن اور اوپر چڑھی مگر جب وہ درخت کی چوٹی پر پہنچ گئی اور وہاں بھی کوئی پھل نظر نہ آیا تو اس نے نیچے کی طرف دیکھا کہ بھائی کو ڈانٹے۔ مگر نیچے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ بھائی بڑی تیزی سے نیچے اُتر رہا ہے اور اترتے اترتے اس نے کلہاڑی سے درخت کی ساری شاخیں کاٹ ڈالی ہیں اب تو بہن بہت سٹپٹائی۔ شاخیں کٹ جانے سے نیچے اترنے کا کوئی سہارا نہ رہا تھا وہ ڈر اور خوف سے کانپنے لگی اور چلانے لگی "بھیا بھیا" مگر بھائی نے کوئی جواب نہ دیا اور

اور چپ چاپ اتر کر گھر کی طرف چل پڑا۔

اب بہن چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ مگر سننے والا کون تھا۔ وہ یونہی "بھیّا بھیّا" پکار رہی تھی کہ اچانک اس کے بازو پروں میں تبدیل ہو گئے اور وہ دیکھتے دیکھتے چڑیا بن گئی بس اسی دن سے وہ چڑیا بنی ہوئی اپنے بھیّا کو پکارتی پھرتی ہے۔ اپنے بھائی کے ساتھ جو بدسلوکی اس نے کی تھی۔ اس پر اسے اتنی شرم آتی ہے کہ دن کے وقت وہ کسی کو منہ نہیں دکھاتی اور رات کے وقت بھائی کو ڈھونڈتی ہوئی جنگل میں ایک درخت سے دوسرے درخت تک اڑتی پھرتی ہے۔

---

(۴۱)

آسِن کے کارنامے

[یہ جنوبی امریکا کے ملک بولیویا کی کہانی ہے۔ وہاں کے قدیم ریڈ انڈین لوگوں میں ایسی کہانیاں عام طور پر مشہور ہیں جن میں خاص طور پر اس شخص آسِن کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ آسِن ایک بڑا جادوگر تھا جو اپنے جادو کے زور سے ان تمام لوگوں کو سخت سزا دیتا جو اس کو ذلیل کرتے اور اسکا مذاق اڑاتے تھے]

بہت دنوں کی بات ہے کہ امریکا کے ایک گاؤں میں ایک قبیلہ ٹلاگا نامی رہتا تھا قبیلے کے سردار کا نام نل آرتے تھا۔ نل آرتے بڑا بہادر آدمی تھا۔ دوسرے گاؤں میں رہنے والے قبیلے اس سے ڈرتے تھے۔ نل آرتے کے قبیلے کے لوگ بڑے بہادر، لمبے تڑنگے اور خوبصورت تھے۔ انہیں اپنی طاقت اور خوبصورتی پہ بڑا گھمنڈ تھا۔

ایک دن اس گاؤں میں ایک آدمی پہنچا۔ یہ آدمی بہت بدصورت اور کُبڑا تھا اس کے سر پر بال بھی نہ تھے۔ لومڑی کی کھال کا بنا ہوا ایک بڑا سا چوغہ اس نے پہن رکھا تھا۔ گاؤں والے اس کی صورت شکل اور حالت دیکھ کر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ مگر اس آدمی نے نہ تو اُن کے مذاق کا بُرا مانا اور نہ کسی سے کچھ کہا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے بتایا۔ میرا نام آسِن ہے۔

آسن نے گاؤں کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا لیا اور اسی میں رہنے لگا۔ گاؤں والے ہر وقت اس کی ہنسی اڑاتے مگر وہ کچھ نہ کہتا۔ گاؤں کے لوگ اسے ایک فقیر سمجھ کر کبھی کبھی کچھ خیرات بھی دے دیتے اور آسن خاموشی سے لے لیتا۔

ایک دن آسن نل آرتے کے گھر پہنچا۔ ابھی وہ دروازے ہی میں تھا کہ نل آرتے بولا "خبردار اندر قدم نہ رکھنا! کیا چوری کا ارادہ ہے؟" مگر آسن نے بہت نرمی سے کہا "جی نہیں، مَیں آپ کی بیٹی سے کنگھا مانگنے آیا ہوں۔" یہ سُن کر نل آرتے قہقہے لگانے لگا اور کہنے لگا "تم کنگھا لے کر کیا کرو گے۔ تمہارے سر پر تو ایک بال بھی نہیں ہے۔" مگر نل آرتے کی بیٹی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ وہ باہر نکل آئی اور آسن سے کہا "تم شوق سے میرا کنگھا لے سکتے ہو۔" آسن نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کنگھا لے کر دریا کی طرف چلا۔ لڑکی نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی، یہ کنگھا لے کر کیا کرتا ہے اور وہ پانی لانے کا بہانہ کر کے گھڑا لے کر دریا کی طرف چلی۔ دریا پہ پہنچ کر اس نے دیکھا کہ آسن نے دریا کے کنارے اپنا چوغہ اتار دیا۔ چوغہ اتارتے ہی وہ ایک بہت ہی خوب صورت نوجوان بن گیا۔ اس کے سر پہ بہت خوب صورت لمبے لمبے سیاہ بال نکل آئے اور وہ سر میں کنگھا کرنے لگا۔ نل آرتے کی لڑکی نے اسے دیکھا تو بڑی خوش ہوئی اور دل میں طے کر لیا کہ میں اسی نوجوان سے شادی کروں گی۔ یہ سوچتی ہوئی وہ گھڑا بھر کر گھر آ گئی۔

جب آسن کنگھا واپس کرنے گیا تو لڑکی نے کہا "آؤ بیٹھو باتیں کریں۔" آسن نے کہا "مَیں تمہارے ساتھ کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ مَیں تو بہت بدصورت ہوں۔" مگر لڑکی نے جواب دیا "مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مَیں تو تم سے شادی کروں گی۔" آسن نے یہ سن کر کہا "پھر تو ہمیں ایسی جگہ بیٹھنا چاہیئے، جہاں دوسرے بھی ہمیں

دیکھ سکیں۔" لڑکی گھر میں سے ایک دری اٹھا لائی اور گھر کے باہر بچھا کر دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ جب لوگوں نے ان دونوں کو ایک جگہ بیٹھے باتیں کرتے دیکھا، تو کہنے لگے کہ نل آر تے کی بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔ جو ایسے بدصورت آدمی کے ساتھ اس نے شادی کر لی۔ نل آر تے انہیں دیکھ کر بہت خفا ہوا اور اپنی بیٹی سے کہا کہ اس بدصورت آدمی کے ساتھ مت بیٹھو۔ مگر لڑکی نے جواب دیا کہ میں تو اس سے شادی کر چکی ہوں۔

اس رات آسن نے بڑے بڑے شعبدے دکھائے۔ اپنے چوغے میں ہاتھ ڈال کر ایک پھردانی نکالی۔ پھر ایک خوب صورت سرخ کپڑا نکال کر اپنی بیوی کو دیا کہ اس کی قمیص بنا لو۔ نل آر تے کی بیوی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ بیٹی سے کہا میں نے تو تمہاری شادی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ بتاؤ مجھے کیا تحفہ دو گی۔ بیٹی نے کہا۔ "جو آپ مانگیں گی۔" ماں نے کہا "مجھے قمیص کے لئے ایسا ہی سرخ کپڑا چاہیے"

آسن نے اسی وقت وہ کپڑا اسے دے دیا۔ پھر اپنے چوغے میں سے ایک پھول دار زرد کپڑا نکال کر بیوی کو دیا کہ تم اس کی قمیص بنا لو۔ اس نے چوغے میں ہاتھ ڈال کر بہت سے پھل اور شہد کا چھتا نکالا اور نل آر تے کی بیوی کو دیا۔ وہ یہ چیزیں لے کر بہت خوش ہوئی۔

دوسرے دن صبح نل آر تے نے قبیلے کے لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ جنگل کے اس پار والے گاؤں میں جو قبیلہ رہتا ہے۔ اس سے ہماری لڑائی چھڑ گئی ہے ہمیں آج ہی ان پر حملہ کر دینا چاہیے۔ یہ سن کر سب لوگ جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ آسن نے بڑی عاجزی سے کہا "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مگر نل آر تے نے بڑی حقارت سے کہا "تم جا کر کیا کرو گے، بلکہ تمہیں دیکھ کر سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ تمہارے

پاس تو گھوڑا بھی نہیں اور گھوڑا ہوتا بھی تو کیا فائدہ تھا۔ تم گبڑے ہو۔ سواری کیسے کرتے
تم ہمیں عورتوں کے ساتھ رہو۔ میری بیٹی پاگل ہے جس نے تم جیسے بھکاری کو اپنا شوہر
بنایا۔ اب وہ بھی زندگی بھر بھکاری رہے گی۔ کیونکہ میں تو اسے کچھ بھی نہ دوں گا۔"
آسن یہ سن کر چپ ہو رہا۔

جب نل آرتے اور قبیلے کے دوسرے لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے تو آسن نے کہا۔ اب میں بھی جاؤں گا۔ وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر چلا۔ گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد اُس نے زور سے تالی بجائی۔ تالی بجانا تھا کہ اس کا گدھا ایک بہت ہی خوبصورت گھوڑے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر اس نے تالی بجائی اور ایک حسین نوجوان بن گیا۔ بالکل ویسا ہی جیسا کہ نل آرتے کی بیٹی نے دریا پر دیکھا تھا۔

چلتے چلتے رات ہو گئی تو نل آرتے اور اس کے ساتھیوں نے جنگل میں ڈیرے ڈال دیئے۔ آسن جب ان کے قریب پہنچا تو اس نے تالی بجائی۔ اس کا گھوڑا گدھا بن گیا اور وہ بھی بدصورت اور کبڑا ہو گیا۔ نل آرتے کے لوگوں نے اُسے دیکھا، تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ پھر دو ایک روٹیاں بڑی حقارت سے اس کی طرف پھینک دیں آسن نے چپکے سے روٹیاں اٹھالیں اور لوگوں سے دُور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے چغے میں سے اچھے اچھے کھانے نکالے، خوب پیٹ بھر کر کھائے اور پڑ کر سو گیا۔

صبح جب نل آرتے اور اس کے ساتھی آگے بڑھنے لگے تو آسن بھی اپنے گدھے پر سوار ہو گیا۔ مگر نل آرتے اسے دیکھ کر غصّے میں بھر گیا اور کہا "تم اسی وقت چلے جاؤ۔ تمہیں ساتھ لے جانے سے ہم ذلیل ہوں گے۔" آسن اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اور جب لوگ کافی دُور نکل گئے تو اس نے تالی بجائی۔ گدھا اُسی وقت گھوڑا

بن گیا اور آسن ایک خوب صورت نوجوان۔ پھر وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا، نل اور تے اور اس کے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گیا۔ لوگ اس نوجوان اور اس کے شاندار گھوڑے کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ کون آگیا۔ ایک نے پکار کر کہا "یہ ضرور آسن ہے جو جادو کے زور سے ایسا بن گیا ہے۔ مگر آسن نے کسی سے بات نہ کی، اور بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دشمن قبیلے کے گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں آسن نے سب کو مار بھگایا۔ ان کے گھوڑے اور سازوسامان پر قبضہ کر لیا۔ نل اور اس کے آدمی پہنچے تو یہ ماجرا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر آسن نے کسی سے بات نہ کی اور اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں پہنچا۔ اپنی بیوی سے اس نے کہا۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گا کیونکہ تمہارے باپ اور گاؤں کے لوگوں نے میری بے عزتی کی ہے۔ بیوی نے کہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ جب وہ دونوں جانے لگے۔ تو نل کی بیوی بھی ان کے ساتھ ہو گئی۔

نل اور اس کے ساتھی گاؤں پہنچے تو دیکھا کہ اس کا گھر خالی پڑا ہے۔ نل غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور آسن کو برا بھلا کہنے لگا۔ بعض لوگوں نے اس سے کہا۔ کہ یہ تمہاری غلطی ہے۔ آسن بڑا بہادر انسان ہے۔ مگر تم نے اس کی بے عزتی کی۔ اس پر نل کو اور زیادہ غصہ آگیا اور کہنے لگا جن کو آسن سے محبت ہے وہ اسی کے پاس چلے جائیں۔ یہ سن کر بہت سے لوگ گاؤں سے چلے گئے۔ آسن نے جنگل میں ایک جگہ گھر بنا لیا تھا۔ یہ لوگ بھی وہیں پہنچے اور آسن کے گھر کے اطراف اپنے اپنے گھر بنا لیے۔

نل اب آسن کا جانی دشمن ہو گیا تھا اور اسے مار ڈالنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا آسن کو جادو کے زور سے اس کا پتہ چل گیا۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا۔ جلد ہی سخت جاڑا پڑے گا۔ آندھیاں آئیں گی اور برف گرے گی۔ تم

لوگ اپنے گھروں کو خوب مضبوط بنالو۔ لوگ اسی وقت گھروں کی دیواروں کو، چھتوں کو مضبوط بنانے میں لگ گئے، جب سارے گھر ٹھیک ہو گئے تو آسن نے زور سے تالی بجائی۔ تالی کا بجنا تھا کہ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ ہوا اتنے زور سے چل رہی تھی کہ گھروں کی چھتیں اور دیواریں تک اُڑ جاتیں۔ مگر آسن اور اس کے ساتھیوں کے گھر محفوظ تھے۔ ہوا کے ساتھ کڑاکے کی سردی شروع ہوگئی۔ سردی سے سارے گھروں کی آگ بجھ گئی۔ لوگ سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔ مگر آگ صرف آسن کے گھر میں تھی۔ سب لوگ آگ لینے آسن کے گھر آنے لگے۔ مگر آسن نے آگ صرف اپنے ساتھیوں کو دی نل بھی آگ مانگنے آیا۔ مگر آسن نے کہا ”پہلے تم نے میرا مذاق اڑایا۔ پھر مجھے مارڈالنے کی سوچی۔ میں تمہیں آگ کیسے دوں“ نل روتا پیٹتا گھر لوٹا۔ سردی کے مارے سارے دریا جم گئے تھے۔ پینے کو پانی بھی نہ ملتا۔ دو تین دن کے اندر اندر نل کے گاؤں کے سارے آدمی سردی سے اکڑ اکڑ کر مر گئے۔ جب سرد ہوائیں بند ہو گئیں تو آسن، نل کے گاؤں پہنچا جہاں عورتیں، بچے اور مرد اکڑ اکڑ کر مر چکے تھے۔ آسن نے جادو کے زور سے کسی کو چیل، کسی کو کوّا اور کسی کو گدھ بنا دیا اور نل آر تے کو اس نے مگرمچھ بنا دیا۔ اس طرح آسن نے اپنا مذاق اڑانے والوں کو سزا دی۔

---

(۴۲)

چنگالو کی کہانی

[یہ ملک پیراگوئے کی ایک پسندیدہ اور مقبول کہانی ہے جس میں ایک بچے کی بہادری اور ماں سے محبت کا قصہ بیان کیا گیا ہے یہ ننھا سا لڑکا اپنی جان بچانے کے لئے اکیلا گھنے جنگل میں چلا جاتا ہے اور ڈر خوف کے باوجود ماں کو نہیں بھولتا]

امریکہ میں بہت سے قبیلے بہت پرانے زمانے سے آباد ہیں۔ لوگ انہیں ریڈ انڈین کہتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا رنگ عام طور پر تانبے کی طرح سرخ ہوتا ہے ان قبیلوں میں بہت سی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک ایسی ہی کہانی چنگالو کی ہے چنگالو ان کی زبان میں ایک چھوٹے سے پرندے کو کہتے ہیں جو جنگلوں میں رہتا ہے جب سردی کا موسم آتا ہے تو یہ پرندہ اکثر آبادی میں آجاتا ہے اور پکارنے لگتا ہے اس کی آواز ایسی سنائی دیتی ہے جیسے کہہ رہا ہو "چے سی آسی" ریڈ انڈین قبیلوں کی زبان میں اس کے معنی ہیں "میری امی بیمار ہے"

کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں چنگالو نام کا کوئی پرندہ وہاں نہ تھا۔ البتہ کسی قبیلے میں ایک لڑکا تھا جس کا نام چنگالو تھا۔ ایک دفعہ چنگالو کی ماں سخت بیمار ہو گئی۔ دوا علاج بہت کیا۔ مگر اس کی حالت بگڑتی گئی۔ ایک حکیم نے بتایا کہ جنگل میں ایک خاص بوٹی

ملتی ہے۔ وہ کھلائی جائے تو چنگالو کی ماں اچھی ہو سکتی ہے ورنہ اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ جنگل بہت گھنا اور خطرناک تھا۔ اس میں طرح طرح کے درندے رہتے تھے۔ بڑے بڑے بہادر آدمی جنگل میں جانے سے ڈرتے تھے مگر چنگالو کو اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ اس نے سوچا کچھ بھی ہو میں ضرور وہ بُوٹی لاؤں گا اور اپنی ماں کو اچھا کروں گا۔ بس اس ارادے کے ساتھ وہ جنگل میں پہنچا۔ شیر، بھیڑیے اور چیتے کی آواز سن کر وہ مارے خوف کے کانپنے لگتا۔ مگر پھر ہمت کر کے آگے بڑھتا گیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ جنگل میں بہت دُور نکل گیا۔ بہت دیر تک تلاش کرنے کے بعد ایک درخت کے نیچے سے اُسے وہ بُوٹی مل گئی۔ چنگالو خوشی سے اچھل پڑا۔ فوراً زمین کھود کر بوٹی نکالی اور پتوں میں لپیٹ، بغل میں داب کر گھر کا راستہ لیا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ شام ہو گئی۔ اندھیرے میں چنگالو اپنا راستہ بھول گیا اور اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ جُوں جُوں رات بڑھتی گئی۔ اس کا خوف بھی بڑھتا گیا۔ پھر بیمار ماں کا خیال تھا وہ مارے ڈر کے چیخنے لگا "چے سی آسی" یعنی میری ماں بیمار ہے۔ مگر جنگل میں اس کی آواز کون سنتا۔ بیچارا رات بھر یونہی بھٹکتا رہا۔ صبح ہوئی تو پتا چلا کہ وہ تو جنگل میں کہیں سے کہیں نکل گیا ہے۔ غرض وہ دن رات یونہی بھوکا پیاسا بھٹکتا رہا اور چلاتا رہا۔ "میری ماں بیمار ہے۔"

اُدھر چنگالو کی ماں بیٹے کا انتظار کرتے کرتے مر گئی۔ گاؤں والوں کو چنگالو کا پتا نہ چل سکا۔ مگر جب سردیاں نزدیک آئیں تو ایک نیا پرندہ ان کے گاؤں میں آنے لگا جو پکارتا تھا "چے سی آسی" (میری ماں بیمار ہے) گاؤں والوں نے اس کا نام چنگالو رکھ دیا۔ اس دن سے چنگالو کی پکار سن کر لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ سردیاں آ گئیں۔ اب ہمیں گرم کپڑوں اور آگ کا بندوبست کرنا چاہیے۔

۴۳

نیل کنول

[یہ کہانی جنوبی امریکا کے ایک ملک یوروگوئے کے بچوں میں بہت مشہور ہے۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ نیکی اور رحمدلی کبھی بیکار نہیں جاتی اور جو آدمی دوسروں کے ساتھ نیکی اور رحمدلی کا برتاؤ کرتا ہے اس کو لوگ ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ جنوبی امریکہ میں ایک ملک ہے "یوروگوئے" اس ملک میں ندیوں، تالابوں اور چشموں میں کنول کی طرح کا ایک بہت خوبصورت نیلا پھول اگتا ہے۔ اس پھول کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ اسے ہم "نیل کنول" کہتے ہیں۔

پرانے زمانے میں یوروگوئے میں سب ریڈ انڈین لوگ بستے تھے وہ لوگ خاموش طبیعت کے اور بہت شریف تھے۔ جانوروں کا شکار کر کے یا مچھلیاں پکڑ کر گذارہ کرتے جانوروں کا گوشت ان کے کھانے کے کام آتا اور کھال سے کپڑے بنا لیتے۔ اسی طرح یہ لوگ آرام چین سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک دوسرے ملک سے گورے رنگ کے لوگ وہاں جا پہنچے۔ ان لوگوں نے ان میدانوں میں قبضہ کر لیا جہاں پرانے باشندے شکار کرتے تھے اور وہاں کھیتی باڑی شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے لئے بڑے بڑے گھر اور مضبوط قلعے بنا لئے۔ وہاں کے پرانے بسنے والوں نے پہلے

تو ان سے خوب جنگ کی اور گورے لوگوں کو اپنے ملک سے مار بھگانا چاہا۔ مگر ان کے پاس نئے ہتھیار نہ تھے۔ وہ صرف تیروں، برچھوں اور بھالوں سے لڑنا جانتے تھے اور گورے لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ چند دنوں تک دونوں میں خوب لڑائیاں ہوئیں۔ کبھی یہ جیتتے اور کبھی وہ۔ مگر آخر میں ریڈ انڈین لوگوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ اور وہ دوسری جگہ جا کر بس گئے۔ اس طرح لڑائیاں ختم ہو گئیں اور رفتہ رفتہ ان میں دوستی ہو گئی۔

گورے لوگوں کے سردار کی ایک لڑکی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں اور پیارا سا چہرہ تھا۔ مگر صورت سے زیادہ اچھی اس کی عادت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ریڈ انڈین بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

ریڈ انڈین لوگوں کے بچے اکثر دریا میں تیرتے اور کھیلتے رہتے تھے ایک دن بہت سے بچے اسی طرح کھیل رہے تھے کہ اچانک دریا میں سخت طوفان آ گیا۔ جس سے دریا کے کناروں کے درخت اُکھڑ گئے اور مکان بہہ گئے۔ سارے بچے تیر تیر کر دوسرے کنارے پہنچ گئے مگر ایک چھوٹا بچّہ پار نہ اتر سکا اور لگا ڈبکیاں کھانے بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر بہت سے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ ان میں گورے سردار کی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ لڑکی نے بچّے کو پانی میں ڈوبتے دیکھا تو اس کا دل ہمدردی سے بھر آیا اور اُسے بچانے کی خاطر اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اُسے تیرنا آتا تھا تیرتی ہوئی بچّے کے پاس جا پہنچی اور اُسے پکڑ لیا۔ مگر اب اس میں بچّے کو لے کر واپس آنے کی قوت نہ تھی اس کے باپ نے جو بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو تیرتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کے لئے لڑکا اور لڑکی دونوں کو ساتھ لانا مشکل تھا اس لئے اس نے پہلے لڑکے کو اٹھا لیا اور اسے کنارے پر لے آیا اور پھر بیٹی کو لینے

کے لئے لوٹا۔ مگر ابھی وہ اس تک پہنچا بھی نہ تھا کہ لڑکی پانی کی ایک تیز دھار میں آ کر بہنے لگی اور تھوڑی دُور جا کر ایک بھنور میں ڈوب گئی۔

اُس خوب صورت اور بہادر لڑکی کی موت پر اس کا باپ اور ساتھی ہی نہیں، سارے ریڈ انڈین بھی خوب روئے اور بہت دنوں تک اس کا سوگ منایا۔

بیٹی کی موت کے بعد سردار ہمیشہ غمگین رہنے لگا۔ لوگ طرح طرح سے اُسے بہلاتے۔ مگر اس کا غم کسی طرح دُور نہ ہوتا تھا۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ ایک دن بہت سے ریڈ انڈین سردار کے پاس پہنچے اور انہوں نے ایک بہت خوب صورت سا نیلا پھول اس کے سامنے پیش کیا۔ ان لوگوں نے سردار سے کہا کہ دیکھئے! یہ پھول اُسی جگہ اُگا ہے جہاں آپ کی بیٹی ڈوبی تھی۔ ضرور خدا نے اس پیاری لڑکی کو اُس پھول کی شکل دی ہو گی۔ اس کا رنگ بھی تو بالکل اس کی آنکھوں جیسا ہے۔

بس اس دن سے یہ پھول اس ملک میں اُگنے لگا ہے اور یہ ہے

نیل کنول!

---

(۴۴)

پانچ انڈے

[یہ کہانی بھی جنوبی امریکا کے ایک مُلک ایکوے ڈور کے بچے بہت شوق سے سنتے ہیں۔ اس میں ایک ضدی آدمی اور اس کی ضدی بیوی کا مزیدار قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دونوں اتنے ضدی ہیں کہ کوئی بھی اپنی ضد سے باز نہیں آتا مگر بعد میں جیت بیوی کی ہوتی ہے]

کسی گاؤں میں ایک کسان اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ دونوں اتنے غریب تھے کہ اکثر انہیں کھانے کو کچھ نہ ملتا اور دو دو، تین تین دن فاقے سے گزر جاتے۔

ایک دفعہ انہیں تین دن تک فاقہ کرنا پڑا تو چوتھے دن بیوی نے کہا "آخر ہم بغیر کھائے پیئے کیسے جی سکتے ہیں۔" کسان نے کہا "تم فکر نہ کرو آج میں شہر جا کر پانچ انڈے لاؤں گا۔ اور ہم انہیں اُبال کر کھائیں گے۔"

یہ کہہ کر کسان شہر کی طرف چلا۔ راستے میں ایک آدمی ملا۔ کسان نے اس سے کہا "جناب میں بھوکا ہوں۔ کیا آپ مجھے انڈا خریدنے کے لیے ایک آنہ دے سکتے ہیں" وہ کوئی نیک آدمی تھا اس نے جھٹ سے کسان کو اکنی دے دی۔ اسی طرح اور چار آدمیوں نے اُسے اکنیاں دیں۔ وہ پانچ انڈے خرید کر خوشی

خوشی گھر پہنچا اور بیوی سے کہا "جلدی سے یہ انڈے ابال لاؤ۔ میں سخت بھوکا ہوں۔"
بیوی انڈے ابال کر لائی اور جب دونوں کھانے بیٹھے تو بیوی نے کہا "میں تین انڈے کھاؤں گی کیونکہ میں نے ابالے ہیں۔ مگر کسان نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تین انڈے کھاؤں گا اور تم دو۔"

اب دونوں میں تکرار شروع ہو گئی۔ بیوی کہتی میں تین انڈے کھاؤں گی اور کسان کہتا میں تین انڈے کھاؤں گا۔ بات بہت بڑھ گئی تو بیوی نے کہا "اگر مجھے تین انڈے نہ ملے تو میں مر جاؤں گی۔" مگر کسان بھی ضدی تھا۔ اس نے کہا۔ چاہے کچھ ہو جائے تمہیں صرف دو انڈے ملیں گے۔" یہ سنتے ہی کسان کی بیوی دھڑام سے گر پڑی جیسے کہ مر گئی ہو۔ کسان چلا چلا کر رونے لگا اور جب روتے روتے تھک گیا تو بیوی کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہنے لگا۔ "اب زیادہ بیوقوفی نہ کرو میری بات مان لو میں تین انڈے کھاؤں گا۔ مگر بیوی نے کہا "اگر مجھے تین انڈے نہیں دیتے تو پھر سمجھ لو کہ میں مر گئی۔ اور مجھے دفن کر دو۔" کسان پھر رونے لگا۔ اور جب بہت دیر تک اس کی بیوی نہ اٹھی تو وہ اپنے دوستوں کے پاس پہنچا اور ان سے کہا " میری بیوی مر گئی ہے۔ میرے پاس اُسے دفن کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اب تم لوگ میری مدد کرو۔" دوستوں نے یہ سنا تو فوراً تیاریاں کرنے لگے اور کفن دفن کا سامان لیکر کسان کے گھر پہنچے۔ کسان دوستوں کو ساتھ لے کر گھر پہنچا تو دیکھا کہ بیوی ابھی تک مردہ بنی پڑی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور پھر اس کے کان میں کہا۔ "دیکھو لوگ تمہیں دفن کرنے کو آ گئے ہیں اب بھی وقت ہے۔ میری بات مان جاؤ۔ تم دو انڈے کھا لو اور میں تین انڈے کھاؤں گا۔" مگر بیوی نے وہی جواب دیا کہ "میں تین انڈے ہی کھاؤں گی۔"

کسان کے دوست اُس کی بیوی کو ایک چارپائی پر ڈال کر قبرستان لے چلے
قبرستان میں قبر کھود کر انہوں نے چارپائی اس کے برابر رکھ دی۔ اب اسے
اٹھا کر قبر میں رکھنا باقی تھا کہ کسان نے موقع پا کر چپکے سے اس کے کان میں
کہا "دیکھو اب یہ لوگ تمہیں قبر میں اتار دیں گے۔ اب بھی وقت ہے اپنی ضد
سے باز آ جاؤ۔ اور مجھے تین انڈے کھا لینے دو۔" کسان کی بیوی نے دیکھا کہ اب
تو سچ مچ معاملہ خراب ہے۔ چپکے سے کسان کے کان میں کہا "اچھا تم ہی پانچوں
انڈے کھا لینا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ کسان اسے ساتھ لے کر خوش خوش گھر پہنچا
مگر گھر پہنچ کر جب کھانے بیٹھے تو کسان کی بیوی نے جلدی جلدی تین
انڈے اٹھا کر کھا لئے۔

۴۵

جادُو کے جُوتے

[جنوبی امریکا کے ایک ملک پیرو کے قدیم ریڈ انڈین باشندوں میں یہ کہانی بہت مشہور رہی ہے۔ جادو کے جوتے یا کھڑاؤں جنہیں پہن کر آدمی ہوا میں اُڑ سکتا ہے مختلف ملکوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ اس کہانی سے جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص غریب اور محتاج لوگوں کی مدد کرتا ہے اسے ہمیشہ اچھا صلہ ہی ملتا ہے]

جنوبی امریکہ میں ایک ملک ہے پیرو۔ کہتے ہیں پرانے زمانے میں وہاں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ جس کا نام ہیراکوچا تھا۔ اس کی حکومت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں نہ ریلیں تھیں نہ موٹریں اور نہ دوسری سواریاں اس لیے بادشاہ کے پاس ہر وقت ہرکاروں کی ایک جماعت تیار رہتی تھی۔ یہ سب ہرکارے تیزی سے میلوں بغیر دم لیے دوڑنے میں ماہر تھے۔ جب بادشاہ کسی دور کے علاقے کے حاکم کو کوئی حکم بھیجنا چاہتا تو یہی ہرکارے حکم لیکر جاتے تھے۔ حکم بھیجنے کا طریقہ بھی بہت عجیب تھا۔ اس زمانے میں نہ کاغذ ہوتے تھے نہ قلم ہوتے تھے نہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ اگر بادشاہ کو کوئی حکم بھیجنا ہوتا تو اسی کے لحاظ سے اس کے وزیر

رنگ برنگے دھاگوں سے مختلف قسم کی جھنڈیاں سی بناتے تھے جسے وہ لوگ کیپو کہتے تھے راستوں پر جگہ جگہ چوکیاں بنی تھیں جہاں ہر وقت ہرکارے تیار رہتے۔ بادشاہ کسی علاقے کے حاکم کے نام کوئی حکم دیتا تو وزیر اسی وقت ایک جھنڈی یا کیپو تیار کر کے ہرکارے کو دیتے اور وہ اسے لے کر دوڑتا۔ پہلی چوکی پر پہنچ کر وہ وہیں ٹھہر جاتا۔ اور وہاں سے دوسرا تازہ دم ہرکارہ کیپو لیکر روانہ ہو جاتا۔ اس طرح تھوڑی دیر میں دُور دور تک بادشاہ کا حکم پہنچ جاتا۔

بادشاہ کے پاس جو ہرکارے رہتے تھے۔ ان میں ایک کا نام ہلاچی تھا وہ سارے ہرکاروں سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا۔ پھر بہت سمجھدار اور بادشاہ کا وفادار بھی تھا۔ اسی لئے بادشاہ بھی اُسے سارے ہرکاروں سے زیادہ چاہتا تھا۔ ہلاچی میں ساری باتیں اچھی تھیں مگر ایک بات ایسی تھی کہ اسے اچھی بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک طرح سے بُری بھی کہہ سکتے ہیں اگر وہ کسی آدمی یا جانور کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھتا تو اپنا کام چھوڑ کر اس کی مدد اور خدمت میں لگ جاتا۔ بادشاہ کو بھی ہلاچی کی یہ بات معلوم تھی۔ مگر وہ اس پر کبھی غصہ نہ کرتا تھا کیونکہ ایک مرتبہ ہلاچی نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔

ایک دن بادشاہ نے ہلاچی کو بلایا اور کہا میرا یہ حکم لیکر فوراً میری فوج کے سردار کے پاس لے جاؤ۔ بادشاہ کی فوج اس زمانے میں سرحد پر کسی دشمن کی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی۔ بادشاہ نے ہلاچی سے کہا یہ حکم فوج کے سردار کو جلد پہنچانا ضروری ہے اسی لئے تم راستے میں رُکنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا اور جتنی تیزی سے دوڑ سکتے ہو دوڑ کر جانا۔

ہلاچی نے وعدہ کر لیا کہ وہ راستے میں بالکل نہیں رُکے گا اور بادشاہ کا حکم لے کر چل پڑا۔ وہ بہت تیز دوڑتا ہوا ایک پہاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک دردناک چیخ سن کر اس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک بڑھیا پہاڑی پر سے پھسل کر گر پڑی تھی۔ ہلاچی بڑھیا کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ گرنے سے بیچاری کی ٹانگ

ٹوٹ گئی ہے۔ بڑھیا کو اس حالت میں دیکھ کر ہلاچی اپنا کام اور بادشاہ کا حکم سب کچھ بھول گیا۔ اس نے بڑھیا کو پیٹھ پر اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا اور اس وقت تک اس کی خدمت کرتا رہا۔ جب تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو گئی۔

بڑھیا کی دیکھ بھال میں کئی دن لگ گئے۔ جب وہ ذرا اچھی ہو گئی تو ایک دن ہلاچی کو اچانک بادشاہ کا حکم یاد آ گیا۔ وہ اسی وقت سرحد کی طرف دوڑنے لگا اس دفعہ ہلاچی اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ زندگی بھر نہ دوڑا ہو گا مگر ابھی وہ سرحد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ اس طرف سے ایک دوسرا ہرکارہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ہلاچی کو دیکھا تو کہا "اب جا کر کیا کرو گے۔ جنگ تو ختم بھی ہو گئی اور میں یہی خبر لیکر بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں۔" ہلاچی بڑا گھبرایا اور پوچھا "ہمیں شکست تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں تو!" دوسرے ہرکارے نے جواب دیا "ہم جیت گئے۔ جب تم بڑھیا کو اٹھا کر لے جا رہے تھے تو کسی نے تمہیں دیکھ لیا اور بادشاہ کو خبر کر دی۔ بادشاہ نے دوسرے ہرکارے کے ہاتھ اپنا پیغام بھیج دیا۔"

یہ سن کر ہلاچی کو بہت دکھ بھی ہوا اور شرم بھی آئی کہ میں نے بادشاہ کا حکم پورا نہ کیا۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا مگر بادشاہ نے کہا اب تم میرے پاس نہیں رہ سکتے۔

ہلاچی روتا پیٹتا شہر سے نکل گیا۔ غم کے مارے اس کا برا حال تھا۔ بیچارہ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا۔ ایک دن یونہی گھومتا گھومتا وہ "تیج کا مک" دیوتا کے مندر میں پہنچا جس کی اس ملک کے لوگ پوجا کرتے تھے۔ ہلاچی دیوتا کے قدموں میں گر پڑا اور اس سے مدد مانگنے لگا۔ ابھی وہ دعا مانگ رہا تھا کہ آواز آئی "ہمت نہ ہار ہلاچی تمہیں نکال کر بادشاہ کو بھی اتنا ہی غم ہوا ہے۔ تم واپس بادشاہ کے پاس جاؤ وہ تمہیں معاف کر دیگا۔"

مگر ہلاچی نے کہا "بادشاہ معاف بھی کر دے گا تو کیا ہوگا میری عادت کیسے بدلے گی۔"

آواز آئی "اپنے برابر دیکھو کیا چیز رکھی ہے۔"

ہلاچی نے نظر کی تو وہاں جوتوں کا ایک جوڑا رکھا تھا، دیوتا کی آواز پھر آئی "یہ جوتے پہن کر تم جہاں جانے کا ارادہ کرو گے فوراً وہاں پہنچ جاؤ گے اور اسطرح راستے میں کہیں رُکنے یا ٹھہرنے کا موقع ہی نہ آئے گا۔"

ہلاچی نے اسی وقت جوتے پہنے اور سوچا کہ "میں شہر پہنچ جاؤں"۔ بس سوچنے کی دیر تھی کہ وہ شہر میں تھا۔

بادشاہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہلاچی نے بادشاہ سے کہا "مجھے پھر سے نوکر رکھ لیجیے۔ اب میں راستے میں کبھی نہ رُکوں گا اور آپ کا سب سے تیز رفتار ہرکارہ بن کر دکھا دوں گا۔

بادشاہ یہ سن کر مسکرایا اور کہنے لگا "اچھا! کل ہم سب سے تیز دوڑنے والے چھ ہرکاروں کا مقابلہ کروائیں گے۔ تم بھی شریک ہونا۔

دوسرے دن بادشاہ نے چھ ہرکاروں کو دُور دُور کے چھ علاقوں کے حاکموں کے پاس بھیجا۔ ہلاچی دوسرے ہرکاروں کے ساتھ دوڑتا رہا۔ جب شہر سے کافی دُور نکل گئے تو اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ دوسرے ہرکارے کافی آگے نکل گئے تو ہلاچی نے وہ جوتے پہنے اور اس جگہ کا نام لیا جہاں اسے پہنچنا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس علاقے کے حاکم کے سامنے کھڑا تھا۔ حاکم کا جواب لے کر وہ واپس لوٹا تو بڑی دیر بعد وہ ہرکارے جو ابھی تک اپنی منزل پر پہنچے بھی نہ تھے سب ہلاچی کو واپس جاتا دیکھ کر حیران رہ گئے مگر ہلاچی نے ان سے کوئی بات نہ کی جب وہ ہرکارے کافی دور نکل گئے۔ تو ہلاچی نے پھر جوتے پہنے اور پلک جھپکتے میں بادشاہ کے پاس جا پہنچا بادشاہ اس کی تیزی سے بہت خوش ہوا اور اسے سارے ہرکاروں کا سردار بنا دیا۔ اب ہلاچی کو فرصت بھی بہت ملتی تھی۔ جس میں وہ برابر دوسروں کی مدد اور خدمت کرتا رہتا تھا۔

۴۶

دُنیا کی کہانی

[امریکا کے ایک ملک کولمبیا کے قدیم ریڈ انڈین باشندوں میں یہ کہانی مشہور ہے یہ دنیا کیسے بسی۔ اس پر انسان کیسے آباد ہُوا۔ اس کے متعلق دنیا کے مختلف ملکوں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ انڈونیشیا کے قدیم باشندوں اور امریکہ کے ریڈ انڈین لوگوں میں اس قسم کی کہانیاں عام ہیں ان خیالی کہانیوں میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب انسان کو بنانا چاہا تو مٹی کی مورتیاں بنا کر انہیں آگ پر پکایا۔ پہلی مرتبہ پوری طرح نہ پک سکیں، دوسری مرتبہ بہت زیادہ پک گئیں اور تیسری مرتبہ ٹھیک پک گئیں۔ پہلی مرتبہ خود جو مورتیاں بنی تھیں ان سے گورے رنگ کے لوگ پھیلے۔ دوسری مرتبہ کی مورتیوں سے کالے رنگ کے اور تیسری مرتبہ کی مورتیوں سے سانولے رنگ کے۔

یہ دنیا جس میں ہم سب رہتے بستے ہیں کیسے بنی۔ یہ روشنی کیسے بنی، درخت پہاڑ، پھل پھول، جانور کہاں سے آ گئے۔ یہ باتیں آدمی ہر زمانے میں سوچتا رہا ہے پرانے زمانے میں ان کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں اور کہاوتیں بنتی رہیں۔ امریکا کے ملک کولمبیا کے قدیم باشندوں میں بھی ایک ایسی ہی دلچسپ کہانی مشہور ہے۔]

کہتے ہیں کہ شروع شروع میں یہ دنیا بہت اندھیری، سنسان اور سرد تھی۔ روشنی کا

کہیں نام نہ تھا۔ ہر وقت اندھیرا رہتا تھا۔ زمین پر نہ درخت تھے نہ جانور۔ اس لمبی چوڑی دُنیا میں بس تین آدمی آباد تھے۔ ایک دنیا کا بنانے والا دیوتا نمی کوٹن، اُس کی بیوی اور اُس کا بیٹا۔

نمی کوٹن ہمیشہ اسی فکر میں رہتا کہ یہ دنیا آباد ہو جائے۔ زمین سے نرم نرم مٹی لے کر اس نے عورتوں اور مردوں کے بہت سے پُتلے بنائے اور کوشش کی کہ وہ زندہ انسان بن جائیں۔ کئی دن تک وہ اسی کام میں لگا رہا مگر مٹی کے ان پُتلوں میں جان نہ پڑ سکی۔ اسی طرح برسوں گذر گئے۔ نمی کوٹن برابر پتلے بناتا رہا۔ مگر ایک میں بھی جان نہ پڑ سکی۔

آخر تھک کر نمی کوٹن نے اپنے بیٹے کو بلایا اور اس سے کہا بیٹا تم آسمان پر چلے جاؤ اور وہاں سے زمین پر روشنی ڈالو۔ نمی کوٹن کا بیٹا آسمان پر چلا گیا اور "سُوا" یعنی سورج بن گیا۔ اندھیری زمین روشنی سے جگمگ کرنے لگی۔ سردی دُور ہو گئی اور زمین پھول پودے اُگلنے لگی۔ برف پگھلی اور پانی بہنے لگا۔ اسی طرح دریا اور جھیلیں بن گئیں۔ نمی کوٹن نے جو مٹی کے پُتلے بنائے تھے اُن میں بھی جان پڑ گئی۔ ان میں سے کچھ انسان بن گئے۔ بعض پُتلے پرندے درندے اور چرندے بن گئے اور بعض مچھلیاں۔ اس طرح دنیا آباد ہو گئی۔

مگر نمی کوٹن نے جو انسان بنائے تھے وہ کچھ خوش نہ تھے۔ کیونکہ رات کو جب سُوا (سورج) چھپ جاتا تو دنیا میں پھر سے اندھیرا پھیل جاتا اور آدمی ڈر جاتے۔ ایک دن سارے آدمی مل کر نمی کوٹن کے پاس آئے اور اس سے کہا ہم رات کے اندھیرے سے ڈرتے ہیں ہمارے لئے رات کو بھی روشنی کا انتظام کرو۔

نمی کوٹن کو اپنے آدمیوں سے بہت محبت تھی وہ انہیں ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا تھا اس لئے وہ بھی آسمان پر چلا گیا اور "چیا" یعنی چاند بن گیا۔ اس کی روشنی سے راتوں کا اندھیرا بھی دُور ہو گیا۔ اب دنیا میں رہنے والے بہت خوش تھے وہ نمی کوٹن کی اس مہربانی کے بدلے میں جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا، تو اس کا نام پہلے سُوا یا چیا رکھتے۔ اور اس طرح نمی کوٹن کی مہربانیوں کو یاد رکھتے۔

(۴۷)

گاتی بانسری

[امریکا کے ایک ملک وینی زویلا کی اس کہانی میں بھی بتایا گیا ہے کہ آخر نیکی کی ہی جیت ہوتی ہے اور برائی کو ہار ماننا پڑتی ہے]

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا اس کے تین بیٹے تھے، پیڈرو، جوآن، اور جوس۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار پڑ گیا اور بیماری سے اس کی نگاہ کمزور ہونے لگی بڑے بڑے حکیم ڈاکٹر آئے طرح طرح کے علاج کئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بادشاہ کی نظر اور بھی کمزور ہوتی گئی۔

آخر کار ایک حکیم نے بادشاہ سے کہا "آپ کی آنکھیں صرف ایک دوا سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ یہ دوا زیتون کے پھولوں کے رس سے بنے گی۔"

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا مگر پھر فکر میں پڑ گیا کہ زیتون کے پھول کہاں سے آئیں گے کیونکہ اس کے ملک میں کہیں زیتون کا درخت نہ تھا۔ آخر اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا "میرے پیارے بیٹو! اگر زیتون کے پھول نہ مل سکے تو میں بالکل اندھا ہو جاؤں گا۔" یہ سن کر پیڈرو نے کہا "ابا جان! آپ میرے حصے کی دولت دے دیں۔ میں زیتون کے پھول ڈھونڈنے جاتا ہوں۔"

بادشاہ نے پیڈرو کو اس کا حصہ دے دیا۔ اور پیڈرو زیتون کے پھول کی تلاش میں

نکلا جب وہ اپنے گھر سے بہت دُور نکل گیا تو راستے میں اُسے ایک بڑھیا ملی۔ بڑھیا نے پیڈیف سے خیرات مانگی۔ مگر پیڈیو کنجوس آدمی تھا اس نے بڑھیا کو کچھ بھی نہ دیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ کئی مہینوں تک وہ جنگل میں گھومتا رہا مگر کہیں زیتون کا درخت نظر نہ آیا۔

جب پیڈیو ایک زمانے تک واپس نہ آیا تو بادشاہ نے اپنے دوسرے بیٹے جوّن کو بلایا اور اس سے پھول ڈھونڈنے کو کہا۔ جوّن نے بھی پیڈیو کی طرح اپنا حصہ مانگا اور روپیہ پیسہ لے کر پھول کی تلاش میں چلا۔ راستے میں جوّن کو بھی وہی بڑھیا ملی۔ مگر جون بھی اپنے بھائی کی طرح کنجوس تھا۔ اس نے بھی بڑھیا کو کچھ نہ دیا۔ جوّن مہینوں تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مگر زیتون کا درخت کہیں نہ ملا۔ اُدھر بادشاہ بالکل ہی اندھا ہونے لگا تھا۔ جوّن کئی مہینوں تک واپس نہ لوٹا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے جوّس سے کہا کہ اب تم ہی میرے لئے زیتون کے پھول تلاش کرو۔ جوّس نے کہا "ابا جان مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف میری کامیابی کی دعا کریں۔ میں ابھی پھول ڈھونڈتے جاتا ہوں۔" باپ کی دعائیں لے کر جوّس پھول کی تلاش میں نکلا۔

راستے میں جوّس کو بھی وہی بڑھیا ملی۔ جوّس بڑا رحمدل تھا۔ اس نے کہا "بڑی بی! میرے پاس روپیہ پیسہ تو نہیں ہے۔ ہاں میں تمہیں کھانا کھلا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر جوّس نے اپنا ناشتہ دان کھولا اور اس میں سے آدھا کھانا نکال کر بڑھیا کو دیا۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے ہوئے بڑھیا نے جوّس سے پوچھا۔ تم کہاں جارہے ہو؟ جوّس نے ساری باتیں بتائیں۔ بڑھیا کہنے لگی "یہاں زیتون کے درخت کہاں ہیں؟" مگر جب وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا چکی تو اس نے جوّس سے کہا "میں تمہیں پتا بتاتی ہوں۔ تم مغرب کی طرف چلے جاؤ۔ یہاں سے بہت دور ایک پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں زیتون کے درخت موجود ہیں۔"

جوس بڑھیا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ کئی دن کے بعد وہ اس پہاڑ کے دامن میں پہنچا اور زیتون کے بہت سے پھول توڑ کر خوشی خوشی گھر کی طرف چلا۔ راستے میں اس کے دونوں بھائی پیڈرو اور جوان ملے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جوس زیتون کے پھول لے آیا تو بس جل ہی گئے کہ یہ باپ کا پیارا بن جائے گا۔ انہوں نے زبردستی اس سے پھول چھین لیے۔ جوس نے پھول دینے سے انکار کیا تو انہوں نے مل کر اُسے خوب مارا۔ یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پیڈرو اور جوان سمجھے کہ جوس مر گیا۔ جلدی جلدی ایک گڑھا کھود کر اُسے اس میں دفن کر دیا اور پھول لے کر گھر کی طرف چلے۔

پیڈرو اور جوان گھر پہنچے تو بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ زیتون کے پھولوں سے اُس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ سارے ملک میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ بادشاہ نے دونوں بیٹوں کو بڑے انعام اور خطاب دیے۔ اپنی آنکھیں اچھی ہو جانے اور دونوں بیٹوں کے گھر آجانے پر بادشاہ بہت خوش تھا۔ مگر جوس کی یاد اُسے برابر ستاتی۔

پیڈرو اور جوان نے مل کر اپنے چھوٹے بھائی جوس کو جس جگہ دفن کیا تھا۔ وہاں تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے بانس کے پودے اُگ آئے۔ ایک دن ایک چرواہا اُدھر سے گذرا۔ چرواہا جب بانس کے پودوں کے نزدیک پہنچا تو اسے بانس سے بڑی میٹھی آوازیں گانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے غور سے سنا تو آواز آئی۔

"اے چرواہے میری بانسری بجا۔ میں تمہیں زیتون کے اصل پھولوں کی کہانی سناتا ہوں۔"

یہ سُن کر چرواہے نے ایک پتلا سا بانس کاٹ کر اس کی بانسری بنائی۔ جب بانسری بجائی تو اس میں سے آواز آئی۔

بجاؤ مجھے اور سُنو غور سے
سناؤں گا سچی کہانی تمہیں
کہانی ہے زیتون کے پھول کی"

چرواہے نے اپنے گاؤں والوں کو بانسری کی یہ آواز سنائی۔ سب اُسے سن کر حیران رہ گئے۔ دُور دُور سے لوگ اس عجیب و غریب بانسری کی آواز سننے کے لئے آنے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ کو بھی معلوم ہوئی۔ بادشاہ کو بھی بانسری سننے کا شوق تھا۔ اس نے چرواہے کو بلایا۔ دربار میں جب چرواہے نے بادشاہ کے سامنے بانسری بجائی۔ تو اس سے آواز آئی۔

مرے ابا بنسی بجاؤ ذرا
بجاؤ مجھے اور سُنو غور سے
سناؤں گا سچی کہانی تمہیں
کہانی ہے زیتون کے پھول کی

بادشاہ نے یہ سنا تو بانسری چرواہے کے ہاتھ سے لے لی اور خود بجانے لگا۔ بادشاہ نے بانسری بجانا شروع کی تو بانسری نے جوس کی پوری کہانی سنا دی کہ جوس نے کس طرح زیتون کے پھول ڈھونڈے اور کس طرح پیڈرو اور جون نے اسے مار کر پھول چھین لئے اور جوس کو دفن کر دیا۔ بادشاہ کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔ اس نے پیڈرو اور جون کو اسی وقت قید کر دیا اور خود چرواہے کو ساتھ لے کر بانس کے پودوں کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر بادشاہ نے مزدوروں کو زمین کھودنے کا حکم دیا۔ زمین کھودی گئی تو اندر سے جوس نکلا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ بادشاہ نے اُسے گلے لگا لیا اور خوشی خوشی گھر لے آیا۔

جوس محل میں پہنچا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں اور اسی خوشی میں بادشاہ نے پیڈرو اور جون کو بھی قید سے رہا کر دیا اور سب مل کر چین آرام سے رہنے لگے۔

۴۸

سنہری قربان گاہ

[شمالی اور جنوبی امریکا کے درمیان ایک ملک ہے پاناما۔ یہ کہانی اسی ملک اور وہیں کے ایک گرجا کے بارے میں ہے۔ اس میں اس ملک کے باشندوں کے عقیدے کے مطابق باتیں بیان کی گئی ہیں مگر کہانی دلچسپ اور سبق آموز ہے]

امریکا کے ایک شہر پاناما میں ایک مشہور گرجا ہے جو سینٹ جوزف کا گرجا کہلاتا ہے۔ اس گرجا میں سونے کا بنا ہوا ایک منبر ہے یہ منبر گرجا سے بھی پرانا اور قدیم ہے۔ کہتے ہیں آج سے تین سو سال پہلے یہ منبر اسی نام کے ایک دوسرے گرجا میں رکھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں بحری ڈاکوؤں کی ایک فوج نے شہر پر حملہ کر دیا۔ اس فوج کا سردار ایک مشہور بحری ڈاکو ہنری مورگن تھا۔ جب پاناما میں خبر پھیلی کہ ہنری مورگن اور اس کی فوج جہازوں میں شہر لوٹنے کے لئے آرہی ہے تو سینٹ جوزف گرجا کے پادری بڑے گھبرائے وہ سنہری منبر کو ہنری مورگن سے بچانا چاہتے تھے مگر منبر اتنا بڑا اور وزنی تھا کہ اُسے گرجا سے اٹھا کر لے جانا اور کہیں چھپانا مشکل تھا۔ سارے پادری سر جوڑ کر بیٹھے اور منبر کو بچانے کی ترکیبیں سوچنے لگے مگر کسی کی سمجھ میں کوئی ترکیب نہ آئی۔ آخر ایک پادری نے کہا کہ منبر پر اس طرح رنگ کر دیا جائے کہ وہ دیکھنے میں معمولی لکڑی کا معلوم ہو۔ سب کو یہ ترکیب

پسند آئی ۔ شہر کے دوسرے لوگ بھی پادریوں کی مدد کو آ گئے ۔ انہوں نے مٹی میں کئی قسم کی جڑی بوٹیاں ملا کر ایک رنگ تیار کیا اور رات بھر منبر کو رنگنے میں لگے رہے صبح ہوتے ہوتے سارا منبر رنگا گیا ادھر یہ کام ختم ہوا ادھر ہنری مورگن اور اس کے ساتھی شہر میں آ پہنچے اور لوٹ مار کرنے لگے ہنری مورگن اور اس کے آدمی سب سے پہلے گرجا میں پہنچے اور ایک ایک کمرہ ڈھونڈنا شروع کیا مگر وہاں انہیں کوئی قیمتی چیز نہ مل سکی ہنری مورگن نے جب ایک بوڑھے پادری کو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں ایک برش لئے منبر کو رنگ رہا ہے تو کہنے لگا یہ گندا اور بھدا سا رنگ کیوں لگا رہے ہو؟ رنگنا ہی ہے تو کوئی اچھا سا رنگ لگاؤ ۔" بوڑھے پادری نے جواب دیا ہم غریب لوگ ہیں اچھا رنگ لانے کیلئے ہمارے پاس پیسے نہیں اسلئے اپنے ہاتھ سے رنگ تیار کر کے لگا رہے ہیں ۔"

یہ سن کر ہنری مورگن نے اپنی جیب سے چاندی کے کچھ سکے نکالے اور بوڑھے پادری کو دیتے ہوئے کہا " لو اس سے اچھا رنگ خرید لو ۔"

ہنری مورگن اور اس کے ساتھی گرجا سے چلے گئے تو سارے پادری اور لوگ جو گرجا میں جمع تھے سجدے میں گر پڑے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ ان کا سنہری منبر بچ گیا ۔

گرجا سے نکل کر ہنری مورگن اور اس کے آدمیوں نے شہر کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا ۔ لوگ ان کے ڈر سے بھاگ بھاگ کر چھپتے پھر رہے تھے شام تک لوٹ مار ہوتی رہی اور جب رات ہو گئی تو ہنری مورگن کے لوگوں نے شہر کو آگ لگا دی اور جہازوں میں بیٹھ کر چلے گئے دیکھتے دیکھتے آگ سارے شہر میں پھیل گئی لوگ اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے پادری گرجا کے مینار پر سے آگ دیکھتے اور دعائیں کرتے رہے کہ گرجا کو آگ نہ لگے مگر جب گرجا کے چاروں طرف آگ پھیل گئی اور گرجا کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو پادریوں نے منبر پر سینٹ جوزف کا ایک بت رکھ دیا اور جو چیزیں لے جا سکتے تھے وہاں سے لے کر نکل گئے جب آگ خود بخود بجھ گئی تو پادری گرجا میں واپس آئے ۔ گرجا کا کچھ حصہ جل چکا تھا مگر مٹی سے بنے ہوئے اس رنگ کی وجہ سے منبر آگ سے محفوظ رہا ۔

بعد میں جب سینٹ جوزف کا نیا گرجا بنایا گیا تو یہ منبر اس میں رکھ دیا گیا ۔ جہاں وہ آج تک جوں کا توں رکھا ہے ۔

(۴۹)

چچا کویوٹے کی آخری شرارت

(یہ کہانی ازمیلنڈ وکوافلاڈاوٹنگ کے ایک غیر مطبوعہ نسخہ سے مصنّف کی حسبِ اجازت حاصل کی گئی ہے۔ چچا کریوٹے متوسط امریکا میں اپنی حماقتوں کے لئے مشہورِ عوام ہے)

کسی گاؤں میں چچا کویوٹے نامی ایک بھیڑیا کھیتوں میں رہتا تھا۔ وہ کھلے بندوں ہر جگہ گھومتا پھرتا۔ گاؤں کے لوگ اس کی شرارتوں سے تنگ آ گئے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ بہت ہوشیار تھا اور کسی کے پھندے میں نہ آتا تھا۔ وہاں کے دوسرے چھوٹے چھوٹے جانور اس سے بہت ڈرتے تھے۔ مگر چچا خرگوش اس سے ذرا بھی نہ ڈرتا بلکہ وہ تو اُسے نئی نئی شرارتیں سکھاتا رہتا تھا۔

ایک دن چچا کویوٹے ایک آم کے درخت کے نیچے سو رہا تھا کہ خرگوش وہاں پہنچا۔ اس نے چچا بھیڑیے کو جگایا اور کہا" چچا کویوٹے اٹھو۔ ایک مزے کی خبر لایا ہوں" بھیڑیا اٹھ بیٹھا اور پوچھنے لگا "کیا بات ہے"۔ خرگوش نے کہا "میں ابھی پیڈری کے باغ سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک بڑا اور پکا تربوز دیکھا ہے" یہ سنتے ہی بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا اور خرگوش سے بولا" چلو چلو پیڈری کے باغ چلیں"

دونوں درختوں اور باڑھ کے پیچھے چھپتے چھپاتے باغ میں جا پہنچے۔ بھیڑیے نے جلدی سے تربوز توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا خرگوش کو دیا اور ایک خود کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں تربوز ختم ہو گیا اور صرف چھلکا باقی رہ گیا۔ بھیڑیا بڑا خوش تھا۔ کھڑا کھڑا اپنے ہونٹ چاٹ رہا تھا کہ پیڈری کی بوڑھی باورچن کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آج رات کے کھانے پر ہم تربوز بھی کھائیں گے۔" یہ سن کر بھیڑیے نے کہا "لو آگئی مصیبت، آج رات باورچن کو تربوز نہیں ملے گا تو میرا ہی نام لگے گا۔"

خرگوش نے کہا "میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ تربوز کے چھلکوں میں مٹی بھر کر انہیں جوڑ دیں اور پھر اسے اس کی جگہ رکھ دیں۔"

بھیڑیے کو یہ ترکیب بڑی پسند آئی۔ دونوں نے مل کر جلدی جلدی تربوز کے چھلکوں میں مٹی کیچڑ وغیرہ بھری اور دونوں ٹکڑے خوب مضبوطی سے جوڑ کر تربوز جہاں لگا ہوا تھا وہیں رکھ دیا۔ یہ کام کر کے بھیڑیا تو کھیت کی طرف چلا گیا اور ایک درخت کے نیچے پڑ کر مزے سے سو گیا مگر خرگوش کو دھن لگی ہوئی تھی کہ پیڈری کی بوڑھی باورچن کیا کرتی ہے۔ اس لئے وہ وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد باورچن آئی اور تربوز لے کر گھر میں گئی۔ خرگوش وہیں کھڑا رہا۔ بڑھی باورچن کو گھر میں گئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باورچی خانے سے اس کے غصہ ہونے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جب ذرا چیخ پکار کم ہوئی تو خرگوش بالکل انجان بن کر پیڈری کے باورچی خانے میں پہنچا اور باورچن سے پوچھا "آپ کس پر خفا ہو رہی تھیں؟"

بڑھیا نے کہا "بھیڑیے پر اور کس پر؟ جانتے ہو اس نے کیا حرکت کی ہے؟ پیڈری کا تربوز کھا گیا اور اس کے چھلکوں میں مٹی بھر کر رکھ دی اب جو پیڈری نے کھانے کے لئے تربوز کاٹا تو ساری پلیٹ اور میز مٹی اور کیچڑ سے بھر گئی۔ کس قدر بدتمیز ہے بھیڑیا۔"

خرگوش نے کہا "اگر آپ کہیں تو میں بھیڑیے کو آپ کے پاس لے آتا ہوں پھر آپ

اس سے سمجھ لیں۔"

بڑھیا نے کہا "واہ! میاں خرگوش! تم بھی کتنے اچھے ہو۔ ضرور لاؤ اُسے اور یہ لو اپنا انعام۔" یہ کہہ کر اس نے خرگوش کو ایک پھل اٹھا کر دے دیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر بھیڑیا مزے سے درخت کے نیچے سو رہا تھا۔ اسی درخت پر ایک بڑا سا پرندہ بیٹھا تھا وہ جو زور سے چہچہایا تو بھیڑیے کی آنکھ کھل گئی۔ اسے پرندے کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اور اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "شور مت مچاؤ جی! دیکھتے نہیں ہم آرام کر رہے ہیں۔" اور یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر وہ پرندہ بھی بڑا ضدی تھا وہ بھلا کیوں مانتا! اس نے اور زور سے چہچہانا شروع کر دیا۔ بھیڑیے نے پھر اُسے ڈانٹا اور کہا۔

"اب کے جو آواز نکالی تو وہ سزا دوں گا کہ تم بھی یاد کرو گے۔"

پرندہ اسی وقت چپ ہو گیا۔ مگر اس نے سوچا کہ بھیڑیے کو سزا ضرور دینی چاہیئے۔ اس پرندے کی ایک عجیب خصوصیت تھی کہ جس طرح سانپ ہر سال کینچلی بدلتا ہے اور پرانی کھال اتار پھینکتا ہے اسی طرح وہ پرندہ بھی ہر سال کھال بدل دیا کرتا تھا اور آج ہی اس کے کھال بدلنے کا دن تھا۔ اس نے چپکے سے پرانی کھال اتار کر اس میں پتھر مٹی اور کنکر بھر کر اتنا موٹا کر دیا کہ سچ مچ کا پرندہ نظر آئے اور کھال جہاں خود بیٹھا تھا۔ وہاں رکھ دی اور آپ اُڑ کر ایک دوسرے درخت پر جا بیٹھا اور لگا زور زور سے آوازیں لگانے۔ اب تو بھیڑیا غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھپٹ کر پرندے کو منہ میں پکڑ لیا اور چبانے لگا۔ مگر وہ تو صرف کھال تھی جس میں پتھر، کنکر بھرے ہوئے تھے بھیڑیے نے غصے میں جو دانت چلائے تو کئی دانت ٹوٹ گئے بھیڑیا نیچے گر پڑا اور درد کے مارے تڑپنے لگا۔

اسی وقت خرگوش آ پہنچا اور پوچھا "کیوں چچا کیا بات ہے؟" بھیڑیے نے سارا قصہ سنایا تو خرگوش نے کہا: "تم میرے ساتھ بڑھیا کے گھر چلو۔ اس کی بوڑھی باورچن

کے پاس دانت کے درد کی بڑی اچھی دوا ہے۔"

بھیڑیا تکلیف سے بے حال تو تھا ہی۔ فوراً راضی ہو گیا اور خرگوش کے ساتھ چل پڑا مگر جونہی وہ پیڈری کے باورچی خانے میں پہنچے بوڑھی باورچن ایک جلتی ہوئی لکڑی لے کر آگے بڑھی اور کہا "چچا کو یوٹے! یہ لو انعام تربوز چرانے کا۔" اور یہ کہتے ہوئے اس کی دم کو آگ لگا دی۔ دانتوں کے درد کے ساتھ اب دم بھی جلنے لگی اور بھیڑیا چیختا، چلاتا وہاں سے بھاگا۔ خرگوش اس کے پیچھے پیچھے پکارتا جاتا تھا "خدا حافظ چچا کو یوٹے! ٹوٹے دانت اور جلی ہوئی دُم والے چچا خدا حافظ!" مگر بھیڑیے نے کوئی جواب نہ دیا بھاگتا ہوا سیدھا دریا پر پہنچا اور اس میں چھلانگ لگا دی۔ بس وہ دن اور آج کا دن، بھیڑیا پھر کبھی بستی میں نظر نہ آیا۔

۵۰

کسان اور سوار

[یہ کہانی امریکا کی ایک ریاست کوسٹاریکا کے علاقے میں بہت مشہور ہے ہندوستان اور ہسپانیہ کے باشندے نامی ایک قدیم کہانی سے اخذ و ترجمہ کر کے میریا ڈی ایبھین اینڈ کمپنی " کوسٹاریکا کی اجازت سے شامل کی گئی ہے۔]

ایک دن ایک غریب کسان شہر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ شہر میں ایک بڑا میلا ہو رہا تھا کسان میلا دیکھنے کے لئے جا رہا تھا۔ شہر اسکے گاؤں سے بہت دور تھا۔ کسان نے راستے میں کھانے کیلئے کیلے، آم، مچھلی اور روٹی وغیرہ ایک گٹھڑی میں باندھ لئے۔ گٹھڑی کافی بڑی اور وزنی تھی۔ گرمی کا موسم تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ اتنی وزنی گٹھڑی سر پہ اٹھا کے چلتے چلتے کسان بہت تھک گیا تو راستے میں ایک درخت کے نیچے دم لینے کو بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک گھوڑے سوار بھی وہاں آ پہنچا۔ لباس سے امیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ درخت کے نیچے وہ گھوڑے پر سے اترا اور گھوڑے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کسان نے اسے سلام کیا تو سوار نے بڑی لاپرواہی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ کسان گھوڑے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ اگر مجھے بھی اس پر سوار ہونے کا موقع ملے تو کس مزے سے راستہ کٹ جائے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے سوار سے پوچھا: "جناب آپ کہاں تشریف

لیے جا رہے ہیں؟"

سوار نے اکڑ کر کہا "شہر جا رہا ہوں۔"

کسان بولا "کتنا عجیب اتفاق ہے جناب، میں بھی شہر جا رہا ہوں۔"

مگر سوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد کسان خود ہی کہنے لگا "جناب دھوپ بہت تیز ہے اور راستہ بہت لمبا، کیا آپ مہربانی کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا لیں گے؟"

سوار نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا گھوڑا دو آدمیوں کا بوجھ تو نہیں سنبھال سکے گا اور پھر یہ گٹھڑی بھی ہے۔"

کسان نے پھر اسی عاجزی سے کہا "جناب کم از کم یہ گٹھڑی ہی گھوڑے پر رکھ لیجئے۔ میں پیدل ہی چلا آؤں گا۔"

اس پر سوار نے کہا "میں گھوڑے پر اتنا بوجھ نہیں ڈال سکتا اور یہ کہتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی طرف چل دیا۔"

جب سوار چلا گیا تو کسان نے سوچا کہ "جب پیدل ہی چلنا ہے تو کچھ کھا پی لینا چاہیئے تاکہ جسم میں کچھ جان آ جائے۔" یہ سوچ کر اس نے گٹھڑی کھولی اور کھانے لگا۔ جب پیٹ بھر کر کھا چکا تو گٹھڑی میں سے ایک بوتل نکالی اور رغبت مزے سے شربت پیا۔

سوار جب تھوڑی دُور چلا تو اپنے آپ سے کہنے لگا "اُونہہ! میں اس گنوار کی گٹھڑی لیے چلتا تو میرے دوست کیا کہتے مجھے دیکھ کر!" مگر پھر اسے وہ آم اور کیلے یاد آ گئے جو اس نے گٹھڑی میں دیکھے تھے اور بوتل بھی۔ اب تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ تھوڑی دُور اور چلا تو گرمی کے مارے سخت پیاس لگنے لگی۔ شہر ابھی بہت دُور تھا۔

سوار نے سوچا یہ اگر میں کسان کو ساتھ بٹھا لیتا تو مجھے بھی کھانے پینے کو کچھ مل جاتا۔" یہ سوچ کر اس نے گھوڑے کو واپس کیا اور اسی درخت کے نیچے پہنچا۔ وہاں کسان کھا پی کر اپنی گٹھڑی باندھ رہا تھا۔ سوار نے اس سے کہا "سنو میاں کسان! میں نے تمہاری بات پر بہت غور کیا اور یہی طے کیا ہے کہ تمہیں بھی اپنے ساتھ بٹھا لوں۔"

کسان مسکرایا اور بولا "شکریہ جناب! مگر اب تو میں تازہ دم ہو چکا ہوں۔ اور میری گٹھڑی بھی کافی ہلکی ہو گئی ہے۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔" یہ کہہ کر کسان نے گٹھڑی اٹھائی اور چلنے لگا۔

سوار اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آخر اسے بھوکا پیاسا شہر تک جانا پڑا۔ وہ راستے بھر پچھتاتا رہا کہ اگر میں نے کسان کے ساتھ ہمدردی کی ہوتی۔ تو خود میرا بھی بھلا ہوتا۔

(۵۱)

مرہم کا پودا

[یہ کہانی امریکا کے ایک علاقے ایل سلوے ڈور میں بہت مشہور ہے۔ امریکا کے قدیم باشندے جو ریڈ انڈین (یعنی سرخ ہندی) کہلاتے ہیں اپنے بچوں کو یہ کہانی سناتے ہیں مصنف کی اجازت سے ہسپانوی زبان سے اخذ و ترجمہ کی گئی ہے]

بہت دنوں کی بات ہے ایل سلوے ڈور میں ایک قبیلہ رہتا تھا: "مایا قیچی" اس قبیلے کا نام تھا۔ اس قبیلے کا ایک نوجوان سردار "ہوت زی" ایک دوسرے قبیلے کے سردار "اٹل کاٹل" کی بیٹی "نایا" سے محبت کرتا تھا۔ ہوت زی نے بہت کوشش کی کہ نایا سے اس کی شادی ہو جائے۔ مگر نایا کا باپ اٹل کاٹل اس کا دشمن تھا اور کسی طرح اس سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا اور نایا کو ہوت زی سے ملنے بھی نہ دیتا تھا۔

ہوت زی نے اٹل کاٹل کی بہت خوشامد کی۔ طرح طرح سے اس کو منانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ تنگ آ کر ہوت زی نے بھی زبردستی نایا سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ اب وہ موقعے کی تاک میں رہنے لگا کہ اٹل کاٹل کے قبیلے پر اچانک حملہ کر کے نایا کو اٹھا لائے۔ ایک رات زوردار بارش اور آندھی آئی۔ ندیاں زور شور سے

بہنے لگیں۔ رات گھپ اندھیری تھی۔ ہوت زی نے سوچا۔ یہ موقع بہت اچھا ہے۔ اپنے آدمیوں کو لے کر اٹل کاٹل کے گاؤں پہنچا۔ ہوت زی سوچ رہا تھا کہ ایسی اندھیری اور طوفانی رات میں سب اپنے گھروں میں دبکے پڑے ہوں گے مگر وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ کہ اٹل کاٹل اور اس کے ساتھی جاگ رہے ہیں اور لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ ابھی ہوت زی اور اس کے ساتھی گاؤں کے اندر پہنچے بھی نہ تھے کہ اٹل کاٹل کے آدمی ان پر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ہوت زی اور اس کے بعض ساتھی مارے گئے۔ بعض زخمی ہوئے اور جو بچ گئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ نابا کو لڑائی کی خبر ملی تو وہ اپنی چھ وفادار کنیزوں کو ساتھ لے کر چھپتی چھپاتی اس جگہ پہنچی، جہاں لڑائی ہوئی تھی۔ اٹل کاٹل کے لوگ اُدھر جنگ جیتنے کی خوشیاں منانے میں لگے تھے اور ادھر نابا اور اس کی کنیزیں زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرنے لگیں۔ اور رات بھر اسی کام میں لگی رہیں۔

صبح ہوئی تو ایک آدمی نے اٹل کاٹل کو جا کر بتایا کہ سات عورتیں میدان میں پڑے ہوئے زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔ اٹل کاٹل یہ سن کر میدان کی طرف گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی نابا مردہ ہوت زی کا سر اپنی گود میں لئے بیٹھی ہے اور اس کی کنیزیں زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر اٹل کاٹل غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اپنے ایک آدمی سے تیر کمان چھین کر اس نے نابا کو تاک کر تیر مارا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ نابا کی کنیزوں کو بھی تیر مار کر ہلاک کر دیں۔ پھر نابا اور اس کی کنیزوں کو وہیں دفن کر دیا۔

نابا اور اس کی کنیزوں کی موت کا گاؤں کے لوگوں کو بہت غم ہوا۔ چند دن تک تو کوئی اس میدان کی طرف جاتا بھی نہ تھا۔ بہت دن بعد چند لوگ میدان کی

طرف گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نابا اور اس کی کنیز دونوں کو جہاں دفن کیا گیا تھا وہاں سات بہت خوب صورت [illegible] اُگ آئے ہیں۔ پودوں سے خوشبو نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے اس سے پہلے ایسے پودے کہیں نہ دیکھے تھے۔ پودوں کے تنے کی چھال سے کالا کالا گوند سا نکلتا تھا۔ یہ گوند زخموں پر لگانے سے زخم فوراً اچھے ہو جاتے تھے۔ اس طرح نابا اور اس کی کنیز دونوں نے زخمیوں کے ساتھ جو ہمدردی کی تھی۔ اس کی ایک یادگار قائم ہو گئی۔ گاؤں کے لوگوں نے ان پودوں کا نام بھی "نابا" ہی رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ یہ پودے بڑھتے اور پھیلتے گئے۔ اور تھوڑے ہی دن بعد سارے ملک میں یہ خوب صورت اور مفید پودے اُگنے لگے۔ جس کا نام لوگوں نے "بلسان" رکھ دیا۔ آج بھی اس درخت کا گوند دوست دشمن ہر ایک کو یکساں فائدہ پہنچاتا ہے اور مرہم کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

۵۲

دیووں کا خاتمہ

[اسپین کے لوگوں نے جب جنوبی امریکہ کے ملکوں ہونڈوراس، گوئٹے مالا اور ال سلوے ڈور پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں مایا قیچی قبیلے کے ریڈ انڈین آباد تھے ان کی زبان قیچی کہلاتی تھی جو اب بھی امریکہ کے وسطی ملکوں کے قبیلوں میں بولی جاتی ہے۔ مایا قیچی قبیلے کے لوگوں میں دنیا اور اس کی ابتدا کے متعلق بہت سی کہاوتیں مشہور ہیں۔ یہ کہانی بھی انہی میں سے ایک ہے ان ساری کہانیوں کو آج سے کوئی تین سو برس پہلے ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا گیا تھا۔ پھر دو سو سال تک کسی کو اس کتاب کا پتہ نہ چل سکا۔ دو سو سال بعد یہ کتاب ملی اور اس کے بعد سے امریکا اور انگلستان میں کئی کتابیں اس کی کہانیاں لیکر شائع کی گئی ہیں یہ کہانیاں جو قیچی اور مایا قبیلوں کی دیومالائیں کہلاتی ہیں وہاں کے عالموں نے اپنے درختوں کی پتیوں پر تحریر کردہ مسودوں سے جمع کیں انہیں سب سے پہلے گوئٹے مالا ئی سان کارلوس یونیورسٹی میں ۱۸۵۴ء میں دریافت کیا گیا۔ اس کہانی میں ایک دیو اور اس کے دو بیٹوں کا ذکر ہے کہانی پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دیو کے دونوں بیٹے اصل میں زلزلہ اور آتش فشاں ہیں اور خود دیو سورج دیوتا مایا زبین ہے اور دوسرا چن دیوتا اصل میں آندھی ہے اور شاید اسی نام کی وجہ سے

انگریزی میں آندھی کو "ہری کین" کہتے ہیں۔ اس کہانی کا اصل ماخذ میکسیکو اور پیرو کی دیو مالائیں ہیں جسے انگریزی میں "لیوس اسپنس" نے ترجمہ کیا۔ اور "تھامس وائی کراویل کمپنی نیویارک" نے ۱۹۱۳ء میں شائع کیا۔

پرانے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ جب دنیا شروع ہوئی تو دیوتاؤں اور دیووں میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی اور ہر ایک اس دنیا پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کی فکر میں رہتا تھا اس کہانی میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اس کی اشاعت کی اجازت جارج جی ہیرپ اینڈ کمپنی لندن سے حاصل کی گئی۔]

امریکہ کے قدیم باشندے ریڈ انڈین کہلاتے تھے ان کے کئی قبیلے ہیں جن میں ایک کا نام مایا تھا۔ مایا قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ یہ دنیا بننے سے پہلے ہُراکان دیوتا ایک دن آندھی بن کر ہر طرف پھیل گیا۔ اس نے زور سے پکارا "زمین"! اس آواز کے ساتھ ہی زمین کا کُرہ اُبھر آیا۔ جب اس طرح زمین بن گئی تو سارے دیوتا مل کر بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے پہلے انہوں نے طرح طرح کے جانور بنائے پھر طے کیا کہ اب آدمی بھی بنائیں۔ لکڑی سے انہوں نے آدمی کے پتلے بنائے اور ان میں جان ڈالی۔ مگر یہ نئے آدمی جو دنیا میں بسے وہ دیوتاؤں کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ اس پر دیوتا ان سے ناراض ہو گئے اور انہیں تباہ کرنے کے لئے زمین پر ایک زبردست سیلاب بھیجا۔ چند آدمی اس سیلاب سے بھی بچ نکلے اور آج بھی ان کی اولاد جنگلوں میں رہتی ہے جن کو ہم بندر کہتے ہیں۔ سیلاب کے بعد دیوتاؤں نے دوسرے آدمی بنائے جو اب تک موجود ہیں۔

دیوتاؤں کے بھیجے ہوئے اس سیلاب سے چند دیو بھی بچ نکلے جن سے دیوتا بڑے خفا تھے ان میں سے ایک دیو کا نام تھا ووکب کاکس۔ اس کے معنی ہیں آگ سے سات گنا زیادہ سُرخ۔ اس دیو کا رنگ بڑا چمک دار سرخ تھا اور دانت زمرد کے۔ اس کا بدن چاندی

اور سونے کی طرح جگمگ جگمگ کرتا رہتا تھا۔ وو کب کا لگس کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا اور وہ دیوتاؤں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ وو کب کا لگس کو جان سے مارنے اور اس کے غرور کی سزا دینے کے لئے دو دیوتا زمین پر بھیجے گئے۔ یہ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ ایک کا نام تھا "ہن آپو" یعنی سردار اور دوسرے کا نام تھا "بالنکی" یعنی چھوٹا شہر۔

ہن آپو اور بالنکی نے زمین پر آکر سب سے پہلے وہ درخت ڈھونڈ نکالا جس کے پھل وو کب کا لگس کھاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا درخت تھا جس پر سنہرے پھل لگتے تھے۔ ہن آپو اور بالنکی درخت پر چڑھ گئے اور چن چن کر سارے پھل کھا گئے۔ جب وو کب کا لگس آیا تو دیکھا کہ درخت پر ایک پھل بھی نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی نظر ہن آپو اور بالنکی پر پڑی، سمجھ گیا کہ پھل یہی دونوں مل کر چٹ کر گئے ہیں۔ غصے میں آکر ان پر جھپٹا مگر ہن آپو نے ایک بڑا سا پائپ منہ سے لگا کر زور سے پھونکا تو اس میں سے ایک زہریلا تیر نکل کر وو کب کا لگس کے جبڑے میں لگا اور وہ نیچے گر پڑا۔ ہن آپو بھی نیچے اترا اور اس سے کشتی لڑنے لگا۔ وو کب کا لگس نے غصے میں آکر ہن آپو کا بازو پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ بازو اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگیا اور وہ ہن آپو کا بازو ہاتھ میں لئے درد سے چیختا کراہتا اپنے گھر پہنچا۔ گھر جا کر اس نے ہن آپو کا بازو آگ پر لٹکا دیا اور اسے بھوننے لگا۔ اس طرح وہ دیوتاؤں پر غصہ اتارنے لگا۔

ہن آپو اور بالنکی بھی وو کب کا لگس کو ختم کرنے کی ٹھان چکے تھے اور اب انہیں اس سے وہ بازو بھی چھیننا تھا۔ دونوں مل کر دو بڑے جادوگروں کے پاس گئے اور ان سے مدد مانگی۔ جادوگر ان کی مدد کو تیار ہو گئے۔ جادوگروں نے حکیموں کا بھیس بنا لیا اور ہن آپو اور بالنکی ان حکیموں کے بیٹے بن گئے۔ دور ہی سے انہیں وو کب کا لگس کی آوازیں آنے لگیں جو درد سے چیختا اور دیوتاؤں کو برا بھلا کہتا جاتا تھا۔ چاروں اس کے پاس پہنچے، اور

کہا کہ ہم آپ کی آوازیں سن کر آپ کی مدد کو آئے ہیں۔

ووکب کاگلس نے کہا "ان شریر دیوتاؤں نے مجھ پر زہریلے تیر سے حملہ کیا ہے کیا تم میرا علاج کر سکتے ہو؟"

جادوگروں نے کہا "ہم ضرور تمہارا علاج کریں گے مگر اس کے لئے تمہارے دانت نکالنے ہوں گے۔ ان کی جگہ ہم مکئی کے دانے لگا دیں گے۔"

جادوگروں نے اس کے دانت نکال دیئے اور دانتوں کی جگہ مکئی کے دانے لگا دیئے۔ مکئی کے دانے لگاتے ہی ووکب کاگلس کی ساری طاقت ختم ہو گئی اس کا چمکدار رنگ ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور مر گیا۔ اس کے مرتے ہی ہن آپو نے آگ پر سے اپنا بازو اٹھا لیا۔ جادوگروں نے وہ بازو پھر اس کے جسم پر لگا دیا اور وہ پہلے کی طرح ہو گیا۔

ووکب کاگلس تو مر گیا مگر ابھی اس کے دو بیٹے باقی تھے۔ بڑا جس کا نام "زپاکنا" تھا۔ ایسا طاقتور تھا کہ ایک پہاڑ اٹھا کر دوسرے پہاڑ پر رکھ دیتا تھا اور چھوٹا جس کا نام "کابراکان" تھا ایسا طاقتور تھا کہ بڑے بڑے پہاڑ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا تھا۔

ہن آپو اور بالنکی پہلے اس علاقے میں پہنچے جہاں زپاکنا رہتا تھا۔ وہاں انہوں نے چار سو آدمیوں کو جمع کیا اور انہیں زپاکنا کو مارنے کی ترکیب بتائی۔ لوگوں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور ایک بڑی گہری خندق کھودی جیسے کسی بڑے مکان کی بنیاد رکھنی ہو۔ پھر ایک بہت بڑا درخت کاٹ کر اسے خندق کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر چار سو آدمی مل کر بھی اسے اس جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اتنے میں زپاکنا وہاں آ پہنچا۔ اس نے یہ حالت دیکھی تو لوگوں کا خوب مذاق اڑایا اور کہا "چلو میں پہنچا دوں یہ درخت۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کندھے پر درخت اٹھا لیا اور اس جگہ پہنچا، جہاں گہری خندق سی

کھُدی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر لوگوں نے کہا "جب آپ یہاں تک درخت لے آئے ہیں تو مہربانی کرکے اسے خندق کے اندر پہنچا دیجئے۔" زپاکنا درخت کندھے پر لئے خندق میں اترا تو لوگ چاروں طرف سے خندق میں پتھر، لکڑی اور مٹی پھینکنے لگے۔ زپاکنا کو خندق میں ایک سُرنگ سی نظر آئی۔ وہ جلدی سے اس کے اندر جا بیٹھا۔ لوگوں نے دیکھتے دیکھتے خندق پاٹ دی اور سمجھے کہ زپاکنا اندر دب کر مر گیا۔ یہ سوچ کر سب خوشی منانے اور ناچنے لگے اور زپاکنا سرنگ میں چپ چاپ بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ لوگوں کو اور بھی دھوکہ دینے کے لئے اس نے اپنے سر سے کچھ بال توڑ کر چیونٹیوں کے منہ میں دیئے۔ چیونٹیاں بال منہ میں لئے اوپر آئیں تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ زپاکنا مر گیا ہے۔ سب نے بہت خوشیاں منائیں اور اس جگہ ایک بڑا مکان بنایا۔ جب مکان تیار ہو گیا تو اس میں ایک جشن منایا گیا۔ زوردار دعوت ہوئی۔ لوگ جب خوب کھا پی کر مست ہو گئے اور ناچنے گانے لگے تو زپاکنا نے نیچے سے ایسا زور لگایا کہ پورا گھر اڑ گیا اور تمام آدمی اس زور سے اچھلے کہ آسمان پر چلے گئے اور تارے بن گئے۔

ہن آپو اور ما لنکی اپنی اس ناکامی سے بہت رنجیدہ ہوئے مگر انہوں نے بھی زپاکنا کو ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اب انہوں نے لکڑی کا ایک بہت بڑا کیکڑا بنایا اور اسے اس طرح رنگا کہ وہ سچ مچ کا کیکڑا نظر آئے۔ یہ کیکڑا لے کر وہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے جہاں ایک بڑا غار تھا۔ کیکڑے کو انہوں نے غار میں اس طرح رکھا کہ وہ باہر سے نظر آجائے۔ پہاڑ کو چاروں طرف سے کھود کر انہوں نے اس طرح ہلا دیا کہ وہ ایک دھکے سے گر پڑے۔ یہ کام کر کے دونوں نے مچھیروں کا بھیس بدلا اور دریا پہ پہنچے۔ جہاں زپاکنا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ انہوں نے زپاکنا سے کہا کہ ہم غار میں ایک بڑا کیکڑا دیکھ آئے ہیں۔ کیکڑا اتنا بڑا ہے کہ ہمیں اسے پکڑتے ڈر لگتا ہے۔ زپاکنا

نے یہ سن کر اُن کی ہنسی اڑائی اور ان کے ساتھ کیکڑے کی تلاش میں چلا۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو غار میں کیکڑا نظر آیا۔ زپاکنا کیکڑے کو پکڑنے غار میں پہنچا۔ تو ہن آپو اور بالنگی نے مل کر پہاڑ گرا دیا۔ بڑے بڑے پتھر زپاکنا پر گرے اور دیکھتے دیکھتے غار چاروں طرف سے بند ہو گیا۔ زپاکنا نے بہت زور لگایا اور پہاڑ کو ہلانے لگا۔ ہن آپو اور بالنگی ڈر گئے کہ کہیں یہ پھر بچ کر نہ نکل جائے۔ اس لئے انہوں نے اسے جادو کے زور سے پتھر بنا دیا۔

دوکب کالکس اور زپاکنا اس طرح ختم ہو گئے مگر ابھی "کابراکان" باقی تھا یہ اپنے باپ اور بھائی سے بھی زیادہ مغرور اور شیخی باز تھا۔ ہن آپو اور بالنگی اس کی تلاش میں نکلے۔ ایک جگہ انہوں نے کابراکان کو دیکھا جو پہاڑوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر ادھر اُدھر پھینک رہا تھا۔ کابراکان نے ہن آپو اور بالنگی کو دیکھا تو پہاڑ اکھاڑنا چھوڑ کر ان سے پوچھا "تم لوگ کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمارا کوئی نام نہیں۔" انہوں نے کہا "ہم تو شکاری ہیں اور شکار کی تلاش میں جنگل جنگل گھومتے ہیں جہاں کوئی آدمی نہیں ملتا۔ پھر ہمیں نام کی کیا ضرورت ہے؟"

یہ سن کر کابراکان انہیں بڑی حقارت سے دیکھنے لگا۔

ہن آپو اور بالنگی نے پھر اس سے کہا "ہم تمہاری بہت تعریف سن چکے ہیں بھلا دیکھیں تو تم کس طرح پہاڑ اکھاڑ پھینک دیتے ہو؟"

کابراکان نے بڑے غرور سے کہا "کیوں نہیں۔ تم کوئی پہاڑ بتاؤ میں ابھی اسے اکھاڑ دیتا ہوں۔"

ہن آپو نے کہا "مگر پہلے کچھ کھا تو لو۔ صبح سے اتنی محنت کر رہے ہو۔ تمہیں ضرور بھوک لگی ہوگی۔"

کابرا کان بولا "اچھا! مگر تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟"

ہن آپو اور بالنکی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت بلندی پر ایک بڑا سا پرندہ اڑ رہا تھا۔ دونوں نے پائپ منہ سے لگا کر زور سے پھونکا۔ دونوں کے پائپ سے تیر نکلے اور ایک ساتھ پرندے کو لگے۔ پرندہ زمین پر آ گرا۔ کابرا کان ان کی نشانہ بازی پر حیران رہ گیا۔

ہن آپو اور بالنکی نے مل کر آگ جلائی۔ پھر انہوں نے پرندے پر چاروں طرف کیچڑ لگا دی اور اسے آگ میں رکھ دیا۔ کابرا کان کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہ مٹی جو انہوں نے پرندے پر لگائی ہے زہریلی ہے جو آگ کے اثر سے پرندے کے گوشت کو بھی زہریلا کر دیگی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پرندے کو آگ سے نکالا۔ اس کی مٹی الگ کی تو پر بھی الگ ہو گئے اور بھنا ہوا گوشت رہ گیا۔ یہ گوشت انہوں نے کابرا کان کو دیا جو مزے لے لے کر کھانے لگا جب سارا گوشت چٹ کر چکا تو بولا "اب بتاؤ کونسا پہاڑ اکھاڑ پھینکوں۔"

ہن آپو نے کہا "وہ جو دور پورب میں بڑا سا پہاڑ کھڑا ہے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکو تو پتہ چلے کہ تم سچ مچ ایسے ہی طاقت ور ہو یا یونہی باتیں بناتے ہو۔"

زہر اپنا اثر کرنے لگا تھا اور کابرا کان کو درد سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کہا "کونسا پہاڑ، مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔"

بالنکی نے کہا "وہ پورب کی طرف، وہ اونچی چوٹی جدھر سے سورج نکلتا ہے۔"

تینوں تھوڑی دیر تک پورب کی طرف چلتے رہے۔ پھر کابرا کان نے کہا "آج مجھے کم دکھائی دے رہا ہے۔ تم جس پہاڑ کی بابت کہتے ہو وہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

"شاید ڈر کے مارے تمہیں نظر نہیں آتا۔" ہن آپو نے کہا "اور شاید تم فقط شیخی بگھارنے کے کام کے ہو۔"

کابرا کان کو یہ سن کر غصہ آگیا اور کہنے لگا: "میں شیخی نہیں بگھارتا۔ مجھے اس پہاڑ پہ لے چلو۔ تمہیں اکھاڑ کر بتا دوں گا۔"

ہن آپو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لے کر اس بڑے پہاڑ کے دامن میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا: "یہ ہے وہ پہاڑ، اب بھی تمہیں نظر آرہا ہے یا نہیں؟"

مگر کابرا کان نے جواب دیا: "نہیں مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔" پھر اس کے گھٹنے کانپنے لگے، اس کے دونوں گھٹنے آپس میں ٹکراتے تو ڈھول پیٹنے کی آواز آتی تھی۔ اس کے ماتھے سے پسینہ نکل کر پہاڑ کے دامن میں بہنے لگا۔

یالنکی نے کہا: "یہ پہاڑ نہیں اکھاڑ سکتا۔ بس باتیں بنانا جانتا ہے۔"

کابرا کان اس کی بات نہ سن سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہاڑ کو ہاتھ سے پکڑا اور زور لگایا۔ مگر زہر اپنا پورا اثر کر چکا تھا چنانچہ وہ ہانپتے کہہ کر زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔

اس طرح دیوتاؤں نے ہن آپو اور یالنکی کے ہاتھوں تین دیووں کا خاتمہ کر دیا۔

۵۳

زمرّد کی چھپکلی

[جنوبی امریکا کے ملک گواٹے مالا کے علاقے کی یہ کہانی کراموتوں کے متعلق ہے جو کارلوس سمویل چنچیلا کی ہسپانوی زبان سے اخذ کر کے مصنّف کی اجازت سے شائع کی گئی ہے ایسی بہت سی کہانیاں وسطی اور جنوبی امریکہ میں عام ہیں۔

اس کہانی میں جس پادری کا ذکر آیا ہے وہ ۱۹ مارچ ۱۶۲۶ء کو کناری جزیرے کے مقام چافنا میں پیدا ہوا تھا اس کے بزرگوں میں ایک شخص جین ڈی بیٹن کورٹ گزرا ہے یہ انگلستان کا ایک امیر تھا جسے انگلستان کے بادشاہ جان دوم نے کناری کے جزیروں کا گورنر بنا دیا تھا۔ پیڈرو سان جوزف ڈی بیٹن کورٹ ۱۶۵۱ء میں گواٹے مالا پہنچا وہاں اس نے غریبوں اور مسافروں کے لئے ایک سرائے قائم کی وہاں کے قدیم باشندوں کے بچوں کے لئے ایک اسکول قائم کیا بعد میں ایک ہسپتال بھی بنایا۔ ان نیک کاموں میں اس کی امداد صرف دو آدمیوں نے کی۔ ایک بوڑھی عورت اور ایک گونگا اور بہرا مرد پیڈرو ۲۵ اپریل ۱۶۶۷ء کو مر گیا۔ لوگ اس کے نیک کاموں کی وجہ سے اس کی بڑی عزت کرتے تھے آج بھی اس کی قبر وہاں سینٹ فرانسس کے گرجا میں موجود ہے۔]

آج سے تین سو برس پہلے گوائٹے مالا کے شہر "سانٹیاگو" میں ایک نیک دل پادری رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا پیڈرو سان جوزف ڈی بیٹین کورٹ۔ ایک دن یہ پادری کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا شہر کے باہر چلا جا رہا تھا۔ پادری بیٹین کورٹ کو اپنے آرام کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ بہت معمولی لباس پہنتا اور سیدھی سادی زندگی بسر کرتا۔ اُسے ہمیشہ غریبوں کی امداد کی فکر رہتی تھی۔ شہر کے باہر اس نے ایک گھر بنایا تھا۔ جہاں غریب اور بیمار لوگوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ نیک دل عورتیں روزانہ ٹوکریوں میں روٹیاں اور کھانے پینے کی چیزیں لاتیں اور غریبوں کو بانٹتیں۔ مگر وہ جتنا سامان بھی لاتیں غریبوں کے لئے کافی نہ ہوتا کیونکہ وہاں غریب اور بیمار لوگوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ پادری اس سوچ میں تھا کہ ان سب کی مدد کس طرح کی جائے۔

ایک دن پادری یہی سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک غریب ریڈ انڈین پر پڑی۔ ریڈ انڈین ایک لاٹھی ٹیکتا آہستہ آہستہ پادری کے قریب آیا اور اسے سلام کیا۔

پادری نے دیکھا کہ بیچارہ بہت رنجیدہ ہے اس نے پوچھا "تمہیں کیا تکلیف ہے میرے بھائی؟"

ریڈ انڈین نے جواب دیا "میں بڑی مصیبت میں ہوں پادری صاحب! میرا نام جان میئول جوراکان ہے۔ میری بیوی سخت بیمار اور مرنے کے قریب ہے مگر میرے پاس اس کی دوا کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ میرے بچے بھوک سے مر رہے ہیں مگر میں اُنہیں کچھ کھلا نہیں سکتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ سب سچ ہے۔"

پادری نے اس آدمی کی طرف دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سچ کہتا ہے۔ مگر روٹیاں تو ساری بٹ چکی تھیں اور پیسہ بھی پاس نہ تھا۔ پادری نے اپنی جیبیں ٹٹولنا

شروع کیں کہ شاید کچھ پیسے نکل آئیں مگر کچھ نہ نکلا۔ وہ بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ "ضرور خدا مجھے اس آدمی کی مدد کا کوئی راستہ بتائے گا۔"

پادری ابھی اوپر دیکھ رہا تھا کہ اسے پیروں کے پاس سرسراہٹ کی آواز آئی نیچے دیکھا تو ایک چھوٹی سی سبز چھپکلی پاس کے پودے سے نکلی۔ پادری نے جھک کر اُسے اٹھالیا اور اس آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

جان مینول جوراکان کو پادری کی اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا۔ مگر جب اپنی ہتھیلی پر اس نے چھپکلی کو دیکھا تو اور بھی حیران ہوا۔ کیونکہ چھپکلی اس کی ہتھیلی میں مردہ پڑی تھی اور زمرد کی بن گئی تھی۔ خوشی سے اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے پادری کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی شہر کی طرف چلا۔ شہر میں اس نے ایک جوہری کے ہاتھ وہ چھپکلی بیچ دی اور روپے لے کر بیوی کے لیے دوا اور بچوں کے لئے کھانا خریدا۔

اس بات کو کئی برس گذر گئے جوراکان کے بیٹے اب جوان ہو چکے تھے اور شالوں کی تجارت کرتے تھے خود جوراکان بھی بہت سی زمین اور جانوروں کا مالک تھا۔ مگر وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا اور ایک ایک پیسہ جمع کرتا رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ چھپکلی خرید کر پادری کو واپس کر دے۔ جب بہت سا روپیہ جمع ہو گیا تو وہ جوہری کے پاس پہنچا اور اس سے وہ چھپکلی خرید کر پادری کی تلاش میں نکلا۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ پادری کے پاس پہنچا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ پادری بڑھاپے کی وجہ سے بالکل سفید ہو گیا تھا اور اس کے کپڑے بڑے پھٹے اور پرانے تھے۔

جوراکان نے اسے سلام کیا اور کہا "آپ مجھے نہیں پہچانتے ہیں۔ جان مینول جوراکان ہوں۔ وہی جس کو کئی برس پہلے آپ نے زمرد کی چھپکلی دی تھی۔ میں وہی چھپکلی آپ کو واپس کرنے آیا ہوں۔"

پادری یہ سُن کر سوچ میں پڑ گیا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

جوراکان نے کہا "اسے لے لیجئے۔ اس سے مجھے بڑے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ اس سے آپ کے دن بھی پھر جائیں گے اور آپ کی باقی زندگی آرام سے گذر جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے پوٹلی میں سے چھپکلی نکالی اور پادری کو دکھائی، پادری کو ساری باتیں یاد آ گئیں۔ مسکراتے ہوئے اس نے وہ چھپکلی جوراکان کے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ سے اُسے زمین پر رکھ دیا۔ زمین پہ رکھتے ہی چھپکلی پھر سے زندہ ہو گئی اور تیزی سے گھاس میں غائب ہو گئی۔

---

(۵۴)

بینیور کویوٹے اور کُتے

[جے۔ بی لپنکاٹ کمپنی فلاڈلفیا مطبوعہ ۱۹۴۱ء) کی اجازت سے جنوبی امریکا کی ریاست میکسیکو کے قدیم باشندوں میں جو ریڈ انڈین کہلاتے ہیں بھیڑیے کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں جن میں اس کی بیوقوفی کا حال بتایا گیا ہے یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے" اور میکسیکو کی مصوّر کہانیاں" مرتبہ ڈان اسٹارم سے لی گئی ہے اصل کہانی کا عنوان ہے" سینیور کویوٹے اور کتے" جنگل کے جانوروں میں یہ بات مشہور ہے کہ بھیڑیا جتنا چالاک ہوتا ہے اتنا ہی بیوقوف بھی ہوتا ہے اب اسی کہانی میں دیکھ لو کہ بھیڑیا جو سینیور کویوٹے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ جتنا عیّار اور چالاک بننے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی بیوقوفی کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے]

ایک دن سینیور کویوٹے ایک پہاڑی وادی میں بڑے اطمینان سے ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک چٹان کے پاس پہنچا تو چٹان کے پیچھے سے دو کتے نکل کر اس پر لپکے۔ کویوٹے انہیں دیکھ کر جنگل کی طرف سرپٹ بھاگنے لگا۔ وہ جھاڑیوں اور چٹانوں پر سے کودتا پھاندتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک بھاگتے بھاگتے کویوٹے نے سوچا کتے بہت پیچھے رہ گئے ہیں لاؤ دم لینے کے لئے رکا۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کتوں سے بچنے کی کوئی اچھی

جگہ ڈھونڈ نکالے۔ جانتے ہو سینیور کو یوسٹے کون تھا؟ ایک چالاک بھیڑیا جسے اپنی عیاری پر بڑا گھمنڈ تھا۔

ابھی بھیڑیا دم لینے بھی نہ پایا تھا کہ برابر سے دو اور کتے اس پر جھپٹے۔ اب بھیڑیئے کے لئے اُلٹے پاؤں وادی کی طرف بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر کتوں کی دو ٹولیاں بن گئیں۔ ایک ٹولی بھیڑیئے کو پہاڑ سے جنگل کی طرف دوڑا رہی تھی اور دوسری جنگل سے پہاڑ کی طرف! تاکہ وہ تھک کر رہ جائے اور بھاگ نہ سکے۔ بھیڑیا پہاڑ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ مگر اُس کے پیچھے بھی دو کتے تھے اور سامنے کی طرف سے بھی دو کتے چلے آ رہے تھے۔ بھیڑیا پریشان ہو گیا کہ اب کیا کروں۔ اتنے میں اس کی نظر دور ایک غار پر پڑی۔ بھیڑیا جھٹ اس کی طرف مڑا اور پوری طاقت سے دوڑنے لگا۔ کتے اب اس کے بہت قریب آ گئے تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ کون پہلے بھیڑیئے پر حملہ کرے گا۔ بھیڑیا یہ سن کر اور بھی بھاگا جاتا تھا اور سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ غار پر پہنچ کر بھیڑیئے کو اچانک خیال آیا کہ اگر کتے بھی غار میں گھس آئے تو کیا ہو گا؟ اس خیال ہی سے وہ کانپنے لگا۔ مگر اب سوچنے کا موقع نہ تھا۔ کتے اس کی دُم کے بال دانتوں سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ بھیڑیئے نے ایک چھلانگ لگائی اور غار کے اندر پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے غار کا منہ بہت چھوٹا تھا جس میں کتے نہ جا سکتے تھے۔ کتے تھوڑی دیر تک تو غار کے باہر کھڑے بھونکتے اور پیر پٹختے رہے پھر ان کی آواز آنی بند ہو گئی۔

اب بھیڑیا غار میں بالکل محفوظ تھا۔ جب کتوں کی آواز بند ہو گئی تو اس کا ڈر بھی ختم ہو گیا اور لگا اپنی آپ تعریف کرنے کہ واہ میں بھی کتنا عقلمند ہوں کہ یوں کتوں سے بچ نکلا۔ غار میں اور کوئی تو تھا نہیں جس کے سامنے شیخی بگھارتا۔ اپنی ٹانگوں ہی سے باتیں شروع کر دیں اور کہا "میری ٹانگو! بتاؤ تم نے کیا کام کیا؟"

ٹانگوں نے کہا: "ہم نے جھاڑیوں اور چٹانوں پر سے چھلانگیں لگائیں۔ دوڑتے وقت اتنی گرد اڑائی کہ کتّے تم کو نہ دیکھ سکے اور اس طرح تمہیں بچا کر یہاں پہنچا دیا۔"

بھیڑیے نے کہا "شاباش، تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اچھا میرے کانو تم نے کیا کام کیا؟"

کانوں نے کہا: "ہم سنتے اور آہٹ لیتے رہے کہ کتّے کتنی دور ہیں۔ ہماری ہی مدد سے تمہاری ٹانگیں دوڑ سکیں۔"

بھیڑیے نے کہا: "بہت اچھا کیا تم نے۔" پھر بولا "میری آنکھو تم نے کیا کیا؟"

آنکھوں نے کہا: "ہم نے جھاڑیوں اور چٹانوں میں راستہ دکھایا۔ ہم تمہیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں اور پھر اس غار کا پتہ چلایا۔"

بھیڑیا بڑا خوش ہوا اور تن کر کہنے لگا "بھئی میں بھی کتنا شاندار ہوں جو ایسی اچھی ٹانگوں ایسے کانوں اور ایسی آنکھوں کا مالک ہوں۔" یہ کہہ کر اپنے آپ کو شاباش کہنے اور اپنی پیٹھ ٹھونکنے کے لئے پلٹا تو دُم پر نظر پڑی۔ بھیڑیے نے کہا "اخا! اپنی دُم کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اب تو بتا کہ تو نے کیا کام کیا؟"

مگر دُم نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بھیڑیا خود ہی کہنے لگا "تو نے تو فقط میرا بوجھ بڑھا دیا۔ تیری وجہ سے میں زیادہ تیز نہ دوڑ سکا۔ تو نے تو کتوں کو منہ مارنے کا موقع دیا۔ اور مجھے پھنسا دیا ہوتا۔ مگر خیر تو خود ہی بتا کہ آخر تو نے کونسا کارنامہ دکھایا۔

دُم بولی "بتاؤں میں نے کیا کیا؟ میں نے کتوں کو اشارے سے بلایا کہ تم پر حملہ کریں تم دوڑ رہے تھے اور میں کتوں کو تمہارے پیچھے دوڑنے کو بلا رہی تھی۔ تمہاری ٹانگیں خاک اڑا رہی تھیں۔ مگر میں ہل ہل کر کتوں کو نشان بتا رہی تھی۔"

یہ سن کر بھیڑیا غصّے میں آگ بگولا ہو گیا۔ چلّا کر کہنے لگا "خاموش۔ کیا مطلب ہے تیرا!"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دُم پر ایک پنجہ مارا اور اسے کاٹ کھایا۔ پھر کہنے لگا "تو بڑی بے وفا ہے۔ تجھے ہمارے ساتھ اس غار میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی وقت باہر نکل جا، چلی جا یہاں سے۔ تو کتوں سے ملی ہوئی ہے۔ جا انہی کے ساتھ نکل جا یہاں سے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پنجے سے اپنی دُم کو سیدھا کیا اور غار کے باہر دھکیلنے لگا کُتے باہر کھڑے چپ چاپ ساری باتیں سُن رہے تھے جونہی بھیڑیے نے اپنی دُم کو غار کے باہر نکالا کتوں نے جھپٹ کر اُسے پکڑ لیا اور لگے کھینچنے۔ تھوڑی دیر میں میاں بھیڑیے بھی باہر کھنچ آئے اور کتوں نے ان سے جو سلوک کیا۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔

۵۵

گائے کی زبان

(امریکا کے ملک کیوبا میں بہت پرانے زمانے میں جو قبیلے بستے تھے وہ "یوروبا" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ساری دنیا کا حاکم ایک دیوتا کو مانتے تھے جس کا نام "آرولا" تھا۔ "یوروبا" قبیلوں میں دیوتاؤں کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور تھیں یہ کہانی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ "اروبا اور اُتبالا" کا اصل ماخذ "یوروبا" ہی ہے)

دنیا کے سب سے بڑے دیوتا کا نام "اُتبالا" تھا۔ اس کا ایک نائب دیوتا تھا جس کا نام تھا "آرولا" اُتبالا چاہتا تھا کہ آرولا کو دنیا کا حاکم مقرر کر دے۔ مگر پھر یہ سوچتا کہ آرولا ابھی کم عمر ہے یہ کام کر بھی سکے گا یا نہیں۔ آخر اُتبالا نے طے کیا کہ آرولا کی عقل مندی کا امتحان لیا جائے چنانچہ ایک دن آرولا کو حکم دیا کہ میرے لئے لذیذ ترین کھانا تیار کرو۔

آرولا یہ حکم سن کر بازار پہنچا۔ بازار میں بہت سی اچھی اچھی اور مزیدار چیزیں بک رہی تھیں تمام چیزوں کو دیکھنے اور بہت کچھ سوچنے کے بعد آرولا نے گوشت کی دکان سے گائے کی زبان خریدی اور اسے طرح طرح کے مصالحے لگا کر پکایا اور جب زبان پک کر تیار ہو گئی تو اُتبالا کے سامنے پیش کی۔ اتبالا خوب مزے لے لے کر کھانے لگا اور جب کھا چکا تو اس نے آرولا سے کہا: "بازار میں گوشت اور دوسری بہت ساری کھانے کی چیزیں تھیں ، مگر تم نے

زبان کیوں پسند کی؟"

آرولا نے کہا" زبان بڑی اہم چیز ہے۔ اسی سے آپ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ لوگوں کو اچھی اچھی باتیں سکھا سکتے ہیں۔ ان کے اچھے کاموں کی تعریف کر سکتے ہیں اور لوگوں کو اچھی خبریں سنا سکتے ہیں۔

اتبالا نے کہا" تم نے جو کچھ کہا وہ بالکل سچ ہے" اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ آرولا تو بڑا عقل مند ہے۔

مگر اتبالا ابھی اور امتحان لینا چاہتا تھا۔ دوسرے دن اس نے آرولا سے کہا "میرے لئے سب سے زیادہ بدمزہ اور خراب کھانا تیار کرو"

آرولا پھر بازار گیا۔ ساری چیزیں دیکھنے بھالنے کے بعد اس نے پھر بکرے کی زبان ہی خریدی اور اسے پکا کر اتبالا کے سامنے لے آیا۔

اتبالا یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اور آرولا سے پوچھا۔ میں نے لذیذ ترین کھانے کی فرمائش کی تو تم نے زبان پکائی اور اب بدترین کھانے کو کہا تو وہی زبان پکا لائے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

آرولا نے کہا" جناب! زبان ہی سے آپ کسی کی ہتک کرتے۔ اس کے اچھے اچھے کاموں کی برائی کرتے، زبان ہی سے لوگوں کو دھوکا دیتے اور بہکاتے ہیں کئی زبان ہی سے ملک اور قوم کو دھوکہ دیتے اور نقصان پہنچاتے ہیں"

یہ سن کر اتبالا نے کہا" تم نے جو کچھ کہا۔ بالکل سچ ہے۔ تم تو اپنی عمر سے بھی زیادہ عقلمند ہو اور اسی وقت اس نے آرولا کو دنیا کا حاکم بنا دیا۔

۵۶

چاچا بوکی نے گھوڑا کرایہ پر لیا!

(امریکہ کے ملک ہائیٹی کے قدیم باشندوں میں "چاچا بوکی" کے متعلق بڑی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں۔ چاچا بوکی کا دوست "تی مالسی" بھی ہر کہانی میں چاچا بوکی کے ساتھ نظر آتا ہے وہ ہر جگہ اپنی چالاکی سے چاچا بوکی کو دھوکہ دے جاتا ہے اس کہانی کا ماخذ "انکل بوکی آف ہائیٹی" مرتبہ ہیرالڈ کورلینڈر ولیم مارلو اینڈ کمپنی نیویارک (مطبوعہ ۱۹۴۲ء) ہے)

ہائیٹی کے پہاڑی علاقے میں دو آدمی رہتے تھے ایک کا نام تھا۔ "چاچا بوکی" اور دوسرے کا "تی مالسی" چاچا بوکی بڑا موٹا تازہ آدمی تھا۔ مگر تھا بہت سست اور کاہل۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بڑا کام کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر ہر دفعہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ تی مالسی چھوٹے قد کا اور دبلا پتلا آدمی تھا۔ تھا تو یہ بھی کاہل مگر بڑا چالاک تھا۔ جبھی تو اس کا نام بھی "تی مالسی" پڑ گیا تھا جس کے معنی ہیں شرارت اور چالاکی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو دھوکہ دے کر اپنا کام بنا لیتا تھا۔ اسی لئے لوگ اس سے دور دور رہتے تھے۔ مگر چاچا بوکی کو اس کی چالاکی اور شرارت بہت پسند تھی اور وہ ہمیشہ اس سے ملتا جلتا رہتا تھا۔

جب چاچا بوکی کے کھیت میں اناج پک کر تیار ہو گیا تو اناج شہر میں لے جا کر بیچنے کے لئے اسے ایک گھوڑے کی ضرورت پڑی۔ چاچا بوکی اپنے ایک دوست مونا کے پاس

گیا اور اس سے اس کی گھوڑی مانگی۔ مگر موزا نے کہا: میری گھوڑی کل رات سے غائب ہے بہت ڈھونڈا مگر اب تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔"

بوکی نے کہا: "پھر تو بڑی مشکل ہے۔ میں اناج بازار کیسے لے جاؤں گا۔"

موزا نے کہا: "توسین سے ایک گھوڑا کیوں نہیں مانگ لیتے؟"

بوکی نے کہا: "کس کنجوس کا نام لیتے ہو۔ توسین تو گھوڑے ہی کا نہیں بلکہ بات کرنے کا بھی کرایہ وصول کرے گا۔"

مگر توسین سے گھوڑا لئے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ مجبوراً چاچا بوکی توسین کے پاس پہنچا اور اس سے گھوڑا مانگا۔"

توسین نے کہا: "پندرہ روپے کرایہ ہوگا اور دیکھو، گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ لادنا۔ بڑا اچھا گھوڑا ہے وہ۔"

"مگر میرے پاس تو پانچ ہی روپے ہیں اس وقت۔" چاچا بوکی نے کہا۔

توسین نے کہا: "کوئی بات نہیں پانچ روپے ابھی دے دو اور باقی دس کل صبح جب گھوڑا لینے آؤگے دے دینا۔" اور یہ کہتے ہوئے توسین نے وہ پانچ روپے چاچا بوکی سے لے لئے۔ چاچا بوکی دل ہی دل میں توسین کو برا بھلا کہتا گھر آ گیا۔

دوسرے دن صبح چاچا بوکی شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ موزا اپنی گھوڑی پر سوار چلا آ رہا ہے۔ اس نے بوکی سے کہا: "چاچا بوکی میری گھوڑی رات مل گئی تھی۔ اب تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

"مگر میں تو ایک گھوڑا توسین سے لے چکا ہوں۔" چاچا بوکی نے کہا۔

"واپس کر دو۔ اس میں کیا ہے۔" موزا بولا۔

چاچا بوکی نے کہا: "گھوڑا تو ابھی لیا نہیں۔ مگر پندرہ روپے کرائے پر بات ہو چکی ہے اور

پانچ روپے توسین کو مجھے بھی آیا ہوں۔ تم جانتے ہو۔ وہ کتنا کنجوس ہے۔ اب مجھے پانچ روپے واپس تھوڑا ہی دے گا۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُدھر سے تی مالسی آگیا۔ اس نے سب سن کر چاچا بو کی سے کہا: "مجھے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے روپے واپس دلا دوں گا۔"

یہ سن کر چاچا بو کی خوشی سے کھل اُٹھا اور تی مالسی کو ساتھ لے کر توسین کے گھر پہنچا۔ چاچا بو کی نے توسین سے کہا: "ہم گھوڑا لینے آئے ہیں۔ مگر پہلے اُسے دانہ وغیرہ کھلا دو۔"

توسین نے کہا: "وہ دیکھو۔ گھوڑا آم کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہے۔ مگر پہلے تم دس روپے تو دے دو۔"

تی مالسی نے کہا: "مگر ہم دیکھ تو لیں کہ گھوڑا کیسا ہے؟"

"گھوڑا گھوڑے جیسا ہے" توسین نے بگڑ کر کہا اور پھر تی مالسی سے کہنے لگا: "دیکھو چاچا بو کی سے بات ہو چکی ہے۔ اب اس سے پھرنے کی سند نہیں۔"

"مگر ہم اسے ناپ تو لیں" تی مالسی نے کہا اور ایک رسّی لے کر گھوڑے کو ناپنے لگا۔ پھر چاچا بو کی سے کہنے لگا: "چاچا بو کی تمہیں بیٹھنے کے لئے اٹھارہ انچ جگہ چاہیئے۔ تم ادھر بیٹھ جانا میں اُدھر بیٹھوں گا۔ مجھے پندرہ انچ جگہ کافی ہے۔ میری بیوی کو اٹھارہ انچ جگہ چاہئے۔ وہ ادھر بیٹھ جائے گی اور تمہاری بیوی کو بیس انچ جگہ چاہیئے۔ وہ سامنے کی طرف بیٹھ سکتی ہے۔"

توسین نے بگڑ کر کہا: "یہ کیا چار آدمی بیٹھیں گے گھوڑے پر؟"

تی مالسی نے کہا: "ہمیں حساب کرنے دو۔ تم بیچ میں مت بولو۔" اور پھر چاچا بو کی سے کہنے لگا: "اب بچوں کو کہاں بٹھائیں گے؟ تمہارا بڑا لڑکا گھوڑے کی گردن پر بیٹھ جائیگا۔ چھوٹی بچّی اس کی گود میں بیٹھ جائے گی اور منجھلی کو اس طرف بٹھا دیں گے۔"

یہ سُن کر توسین پسینے پسینے ہوگیا اور کہنے لگا "کیا دیوانے ہوئے ہو۔ ایک گھوڑا اتنے سارے آدمیوں کا بوجھ کیسے سنبھالے گا؟"

مگر تی مالسی نے بڑے اطمینان سے کہا "تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی تو سوچنا ہے کہ کس طرح سب کے سب ست داؤ کے میلے میں جا سکیں گے؟"

توسین بڑا گھبرایا اور جلدی سے بولا "تم لوگ گھوڑے کو ست داؤ تک لے جاؤ گے۔ اتنی دور تم سب کو اٹھا کر لے جانے میں تو وہ مر ہی جائے گا۔"

مگر تی مالسی نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور بوکی سے کہنے لگا "میرے بچے گھوڑے کے کان پکڑ کر بیٹھ جائیں گے؟"

توسین بولا "تم پاگل ہو۔ میں ہرگز گھوڑا نہ دوں گا؟"

تی مالسی بولا "مگر بات پکی ہو چکی ہے اور پھر بوکی سے بولا "میرا چھوٹا بچہ کہاں بیٹھے گا؟"

"ہاں ہاں۔ کدھر بٹھائیں اس کو؟" بوکی نے کہا۔

"ادھر بٹھا لیں گے" تی مالسی نے کہا "اور بکریاں وغیرہ زین کے ساتھ باندھ لیں گے؟"

توسین نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "یہ گھوڑا ہے یا جہاز؟ نا بابا میں تو تمہیں گھوڑا نہیں دے سکتا؟"

تی مالسی نے کہا "مگر بات طے ہو چکی ہے۔ اب اگر تم نے زبان بدلی تو ہم عدالت میں جائیں گے؟"

بوکی نے بڑے زور سے سر ہلایا۔ اب توسین بڑا چکرایا اور پانچ روپے جیب سے نکال کر کہنے لگا "یہ لو اپنے پانچ روپے اور میرا پیچھا چھوڑ دو؟"

"پانچ روپے" تی مالسی نے کہا "پندرہ روپے کرائے پر ہم نے گھوڑا لیا تھا۔ اب تم پانچ روپے واپس کرتے ہو۔" "مگر بوکی نے مجھے صرف پانچ روپے دئیے تھے"۔ توسین نے کہا۔

تی مالسی بولا "تم خود کہہ چکے ہو کہ گھوڑا پندرہ روپے کرائے پر لیا گیا تھا۔ اب تم

پانچ روپے دیتے ہو۔ اگر تم پندرہ روپے نہیں دیتے تو ہم عدالت میں جائیں گے۔"

اتنے میں بوکی بول اٹھا: "اور تی مالسی، دادی اماں کو کہاں بٹھائیں گے؟"

"اپنے سر پر!" توسین نے غصے سے کہا اور پندرہ روپے ان کی طرف پھینکتے ہوئے بولا: "چلے جاؤ یہاں سے!"

چاچا بوکی اور تی مالسی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دونوں اتنا ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ گئے اور پھر وہاں سے بوکی کے گھر پہنچے۔ بوکی کی بیوی نے دونوں کو کافی پلائی۔ کافی پیتے ہوئے بھی دونوں ہنستے رہے اور چاچا بوکی نے کہا: "بھئی آج کا دن ہمیشہ یاد رہے گا۔ اتنے کنجوس آدمی کو پانچ روپے دے کر اس سے پندرہ وصول کر لئے۔"

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تی مالسی نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چاچا بوکی نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی ساری خوشی رخصت ہو گئی اور وہ پریشانی کے ساتھ اپنی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ بوکی کی بیوی نے دیکھا تو پوچھا: "خیر تو ہے، کیا پریشانی ہے؟"

چاچا بوکی نے غصے سے کہا: "کہاں گیا وہ چور تی مالسی، پندرہ روپے لے بھاگا۔"

وہ گھر سے نکل کر باہر بھاگا۔ مگر تی مالسی کا کہیں پتا نہ تھا اور جب وہ منہ لٹکائے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی نے کہا: "آج کا دن ضرور تمہیں یاد رہے گا۔" مگر بوکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد خود ہی کہنے لگا: "مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

"کیا نہیں ہو سکتا تھا؟" اس کی بیوی نے کہا۔

چاچا بوکی نے کہا: "دادی اماں کو گھوڑے پر کیسے بٹھا سکتے تھے!"

۵۷

بادشاہ کا مینار

(یہ کہانی جنوبی امریکا کے ملک جمہوریہ ڈومینکن کے قدیم باشندوں میں مشہور ہے اسے جمہوریہ ڈومینکن کی قدیم داستانوں سے مینول ڈی انڈ ریڈ امریکن داستان گو سوسائٹی ڈونشہ ۱۹۳۰ء کی اجازت سے اخذ کیا گیا ہے۔)

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک بادشاہ کو دھن سمائی کہ وہ چاند کو چھو لے۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں رہنے لگا کہ چاند تک کیسے پہنچے۔ ہوتے ہوتے یہ دھن ایسی بڑھی کہ بادشاہ ملک کے کاموں سے بھی غافل ہو گیا۔ دن رات بس چاند تک پہنچنے کی تدبیریں سوچتا رہتا راتوں کو سوتا بھی تو خواب میں یہی کچھ دیکھتا۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد بادشاہ نے طے کیا کہ ایک اونچا مینار بنوایا جائے۔ اتنا اونچا کہ اس پر چڑھ کر چاند کو چھو سکے۔ اس نے ایک معمار کو بلایا اور حکم دیا کہ "ایک اتنا اونچا مینار تیار کرو کہ ہم اس پر چڑھ کر چاند کو چھو سکیں۔" معمار یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اتنا اونچا مینار بنے گا کیونکر! مگر بادشاہ کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت بھی نہ پڑی۔ خاموش چلا آیا اور سوچنے لگا کہ اتنا اونچا مینار کیسے بنے گا۔ بہت دنوں تک معمار سوچتا ہی رہا۔ مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ ادھر بادشاہ کی بے چینی

بڑھتی جا رہی تھی۔ جب کئی ہفتے گزر گئے تو اس سے صبر نہ ہو سکا اور معمار کو بلا کر کہا: "تمہیں تین دن کی مہلت اور دی جاتی ہے۔ اگر ان تین دنوں میں تم نے مینار تیار نہ کر لیا تو تمہیں جان سے مار دیا جائے گا۔"

معمار بیچارہ اور بھی گھبرا گیا۔ دو دن گزر گئے۔ مگر کوئی ترکیب ذہن میں نہ آئی تیسرے دن اسے ایک تدبیر سوجھی۔ وہ بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہا: حضور! میں نے کافی سوچ بچار کے بعد مینار بنانے کی ترکیب نکال لی ہے۔ مگر مناسب یہی ہوگا کہ مینار بننے کے بعد پہلے مجھے اس پر چڑھنے کی اجازت دی جائے۔"

بادشاہ بے صبری سے بول اٹھا: "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مینار پر صرف میں ہی چڑھوں گا۔ بھلا ایک معمار اتنی بلندی پر جا سکتا ہے۔"

معمار خاموش ہو گیا اور بادشاہ کو ترکیب بتا دی۔ بادشاہ نے فوراً سارے ملک میں منادی کرا دی کہ لوگوں کے پاس جتنے صندوق اور ڈبے ہوں وہ سب شاہی محل کے میدان میں لے آئیں۔ لوگ صندوق اور ڈبے لے آئے تو معمار نے وہ صندوق اور ڈبے ایک کے اوپر ایک جمانا شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ سارے صندوق اور ڈبے ختم ہو گئے مگر مینار اب بھی اتنا اونچا نہ بن سکا۔ اس پر بادشاہ نے ملک کے سارے بڑھئی جمع کیے اور انہیں حکم دیا کہ ملک کے سارے درخت کاٹ کر ان کی لکڑی سے صندوق تیار کرو۔ حکم کی دیر تھی سب بڑھئی کام پر لگ گئے اور انہوں نے صندوق بنا بنا کر ڈھیر کر دیے۔ یہ سارے صندوق اسی طرح جمائے گئے۔ اب سارے ملک میں نہ کوئی درخت باقی رہا تھا۔ نہ کسی کے پاس صندوق یا ڈبا!

بادشاہ نے مینار پر چڑھنا شروع کیا جب اوپر پہنچ کر ہاتھ اونچا کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ چاند بس ذرا سا اوپر ہے۔ بادشاہ نے سوچا کہ ایک صندوق اور ہو جاتے۔ تو میں

ضرور چاند کو چھو سکوں گا۔ اُس نے نیچے کے لوگوں کو پکار کر حکم دیا کہ ایک صندوق اور لاؤ۔ مگر صندوق اب کہاں تھا۔ نہ لکڑی تھی کہ صندوق بنایا جاتا۔ بادشاہ کو سخت غصّہ آرہا تھا کہ اس کی اتنی محنت اکارت جارہی ہے۔ اسی غصے میں اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے پکار کر معمار کو حکم دیا کہ سب سے نیچے جو صندوق رکھا ہے۔ اُسے نکال کر اوپر لے آؤ۔ معمار اور بڑھئی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ مگر بادشاہ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے بڑے غصّے سے سب کو ڈانٹا اور چلّا کر کہا: "میرا حکم کیوں نہیں بجالاتے؟ نکالو صندوق اور لے آؤ اُوپر۔"

بادشاہ کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔ پھر جب بادشاہ کو غصّے میں دیکھا تو لوگ اور بھی ڈر گئے اور بڑھ کر نیچے کا صندوق کھینچ لیا۔

صندوق نکالنے کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ ظاہر ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ بادشاہ پھر پتہ بھی نہ چل سکا کہ کہاں ہے۔ نہ آسمان پر نہ زمین پر۔

---

(۵۸)

پال بنیان نے پودا لگایا

[شمالی امریکا میں پہلے جنگل کثرت سے تھے۔ ان جنگلوں سے لکڑی نکالنے کے لیے لکڑہاروں نے جگہ جگہ اپنی بستیاں بسائی تھیں۔ پال بنیان کی کہانیاں انہی بستیوں میں مشہور تھیں۔ اور وہ ان کہانیوں کا ہیرو مانا جاتا ہے۔ ان ساری کہانیوں میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو عقل میں نہیں آسکتیں اور شاید اسی وجہ سے یہ کہانیاں زیادہ مشہور بھی ہو گئیں۔ لوگوں کے جی میں جو کچھ آتا گھڑ کر کہانی بنا لیتے اور پال بنیان کے نام سے وہ کہانی مشہور ہو جاتی۔ قدیم داستان گو سٹتھ تھامسن کا بیان ہے کہ اس نے ان کہانیوں کو مطبوعہ شکل میں آنے سے پہلے اوریگن کے جنگلات میں زبان زدِ عوام پایا تھا۔ امریکا کے مختلف علاقوں میں یہ کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ اس لیے یہ کہانی کسی ایک علاقہ سے مخصوص نہیں بلکہ کل ریاستہائے متحدہ کی کہانی کہلاتی ہے جو کہانی یہاں بیان کی گئی ہے اس واقعہ کو ہیرلڈ کورلینڈر کے حوالہ سے لیا گیا ہے۔]

پال بنیان وہی آدمی ہے جس نے دو منہ والا کلہاڑا بنایا تھا۔ اپنا کلہاڑا لیکر وہ دو درختوں کے بیچ میں کھڑا ہو جاتا اور دائیں بائیں کلہاڑا چلانے لگتا۔ اس طرح وہ ایک ساتھ دو درخت کاٹ لیتا تھا۔ دوسرے لکڑ ہارے یہ کمال تو نہیں کر سکتے تھے مگر وہ

دو منہ والا کلہاڑا برابر استعمال کرتے تھے کیونکہ اسے بار بار تیز کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

جب صنوبر کے اونچے اونچے درخت کاٹنے ہوتے تو دوسرے لکڑہارے پہلے درخت پر چڑھ کر اس کی چوٹی کاٹتے تھے اور پھر تنا کاٹتے تھے۔ مگر پال بنیان ایسا نہیں کرتا تھا وہ درخت کا تنا کاٹنے لگتا اور جب درخت گرنے لگتا تو اچک کر ایک ہی ریس میں اس کی چوٹی کاٹ دیتا۔

پال بنیان کی ہر چیز دنیا سے نرالی تھی۔ اس کے پاس ایک بیل تھا جس کا نام تھا بابی۔ پال بنیان اس پر لکڑیاں لادا کرتا تھا۔ بابی اتنا بڑا تھا کہ اس کے برابر کا بیل ملک بھر میں کہیں نہ تھا۔ اس کا رنگ نیلا تھا اور وہ زمین سے نوے ہاتھ اونچا تھا۔ اس کے سینگ اتنے لمبے چوڑے تھے کہ اگر کوئی ایک سینگ پکڑ کر لٹک جاتا تو اسے دوسرا سینگ دن کے اجالے میں بھی نظر نہ آسکتا تھا۔ ایک دن بابی پال بنیان کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا کہ ایک مکھی نے اسے کاٹ کھایا۔ مکھی بھی اناج کے بڑے ٹوکرے کے برابر تھی۔ بابی تڑپ کر بھاگا اور سینکڑوں میل تک بھاگتا چلا گیا۔ جو ہل وہ کھینچ رہا تھا وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ زمین کھودتا گیا۔ اور چار میل چوڑی اور دو سو میل لمبی ایک نالی سی کھد گئی جہاں آجکل ایک بڑا باغ ہے۔

ایک دان پال بنیان کے گاؤں میں طوفان آیا اور نیلی نیلی برف گرنے لگی۔ دو مہینے تک لگاتار برف گرتی رہی۔ برف زمین پر اتنی اونچی جم گئی تھی کہ اونچے اونچے صنوبر کے درختوں کی چوٹیاں ہی نظر آتی تھیں لکڑہاروں نے برف پر چلنے کے جوتے پہن کر درختوں کی چوٹیاں کاٹنا شروع کر دیں اور جب بہار کا موسم آیا اور برف پگھل گئی تو ان کا کام بہت ہلکا ہو گیا کیونکہ درختوں کی چوٹیاں وہ پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔

جتنے دنوں تک برف گرتی رہی پال بنیان کا بیل بابی جاگتا رہا اس کی وجہ بھی سن لو۔ بات یہ تھی کہ برف اس کی پیٹھ پر گر کر پگھل جاتی اور بہنے لگتی مگر اس کی دم تک پہنچتے پہنچتے پھر جم جاتی۔ اس طرح اس کی دم پر برف جم جم کر اتنی وزنی ہو گئی کہ اس کی کھال کھنچ

گئی اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب بہار میں برف پگھلنے لگی تو اس کی دُم کا بوجھ ہلکا ہوا اور وہ بیچارہ آنکھیں بند کر سکا۔

مگر پال بنیان کے گاؤں میں جو قحط پڑا وہ برف کے اس طوفان سے بھی زبردست تھا۔ یہ قحط کیوں کر پڑا؟ ہوا یہ کہ پال بنیان نے اپنے کھیت میں کدو کی بیلیں لگائیں اور کچھ باجرہ بو دیا۔ ابھی باجرہ بوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی۔ کہ ایک پودا چھ فٹ اونچا اُگ آیا اور ہفتوں کے اندر وہ ایک اونچے مکان کے برابر بلند ہو گیا اور پھر اتنا اونچا ہو گیا جتنا صنوبر کا درخت پچاس سال میں ہو سکتا ہے۔ اور یہ پودا برابر بڑھتا رہا۔ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے اور باجرے کا پودا اس تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کہ اس کے ساتھ زمین کے اندر سے پتھر نکل پڑتے تھے۔

ایسا ہی حال کدو کی بیل کا ہوا۔ یہ بیل اس تیزی سے پھیلی جیسے سانپ دوڑتا ہے جہاں کھلی جگہ نظر آتی وہیں پھیل جاتی۔ لوگوں نے اس کے ڈر سے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں۔ کہیں بھولے سے کسی گھر کی کھڑکی کھلی رہ جاتی تو بیل اس میں سے گھس کر دوسری طرف سے نکل جاتی اور گھر والے اس کو کاٹے بغیر باہر نہ نکل سکتے۔ بیل میں کدو لگنے لگے جو بڑے بڑے مٹکوں کے برابر تھے لوگوں کو راستہ چلنا مشکل ہو گیا۔ ایک آدمی کے دو گھوڑے کدو سے ٹکرا کر مر گئے۔ گاؤں کے دو گودام اور جانوروں کا ایک گھر کدو کے بوجھ سے بیٹھ گیا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کدو کی بیل اور باجرے کے پودے نے ساری زمین کا پانی چوسنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ساٹھ میل کے کھیت سوکھ گئے کنوئیں خالی ہو گئے اور دریا خشک ہو گیا۔ ایک بڑی جھیل کا پانی اس تیزی سے اترا کہ اس کی ساری مچھلیاں ہوا میں لٹکی رہ گئیں۔ جب حالت اور بھی بگڑنے لگی تو لوگ پال بنیان کے پاس گئے اور کہا کہ اپنی کدو کی بیل اور باجرے کے پودے کا کوئی علاج کرو، ورنہ ہم سب بھوکوں مر جائیں گے۔ پال بنیان نے بھی دیکھا کہ معاملہ خراب ہے پہلے اُس نے کدو کی بیل اکھاڑنے کا فیصلہ کیا، مگر اس

کا آخری سرا ڈھونڈنے میں اسے ساڑھے چار گھنٹے تک دوڑنا پڑا۔ آخر ایک گودام میں اُسے بیل کا آخری سرا مل گیا۔ اس نے بابی کے سینگوں سے اسے باندھ دیا اور بابی کو دوڑایا مگر بابی جتنا آگے جاتا کدو کی بیل بھی بڑھتی جاتی۔ آخر بابی نے خوب تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ اور کئی میل تک دوڑتا چلا گیا تب کہیں جا کر بیل جڑ سے اکھڑی۔

کدو کی بیل کے بعد پال بنیان نے باجرے کے پودے کا رُخ کیا۔ اس نے اپنا کلہاڑا خوب تیز کیا اور اُس کے تنے پر ایک وار کیا مگر دوسری دفعہ کلہاڑا چلانے تک پودا چھ انچ اور بڑھ گیا جب بھی پال بنیان کلہاڑا چلاتا پودا چھ انچ اور بڑھ جاتا۔ تنگ آ کر پال نے پودے کی چوٹی کاٹنے کا فیصلہ کیا، اور اپنی کمر سے کلہاڑا باندھ کر وہ پودے پر چڑھنے لگا۔ دو گھنٹے بعد وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لوگ کھڑے رہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ انہیں کھڑے کھڑے دو دن گذر گئے اور تیسرا دن بھی آ گیا۔ مگر پال بنیان کا پتہ نہ چلا۔ ایک آدمی نے آواز دی "پال!" کوئی جواب نہ ملا پھر دو چار نے مل کر پکارا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اسی طرح اور دو دن گذر گئے۔ اب لوگوں نے طے کیا کہ سب مل کر ایک ساتھ پکاریں گے۔ چنانچہ گاؤں کے دو ہزار آٹھ سو آدمیوں نے ایک ساتھ آواز دی "پال" دُور سے انہیں جواب ملا "ہاں"! پھر لوگوں نے چلا کر کہا "تم کب کاٹ رہے ہو پودے کو؟" جواب ملا "ابھی تک نیچے نہیں گرا؟ میں درخت کی چوٹی تین دن پہلے کاٹ چکا ہوں۔"

اب لوگوں نے دیکھا کہ پودے کا بڑھنا بند ہو گیا ہے۔ بڑی جھیل میں پانی بھی نہیں اتر رہا ہے اور پھر دریا میں بھی پانی بہنے لگا۔ کھیتوں میں اناج اُگنے لگا اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

۵۹

جین لباڈی کا کتا

[شمالی امریکا کے ملک کینیڈا میں یہ کہانی بہت مشہور ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ آدمی جھوٹ بول کر کتنی پریشانی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کہانی کا ماخذ "جین لباڈی کا بڑا سیاہ کتا ہے اور جس کی اصل" بولتی ہیں"۔ مطبوعہ میپل سیلوج کارلسن ہارپر برادرس نیویارک سنہ ۱۹۵۲ء ہے]

آؤ ہم تمہیں جین لباڈی کی کہانی سنائیں۔ جین لباڈی ایک دن صبح کے وقت اپنے گھر کے پچھواڑے پہنچا۔ اس نے مرغی کے چوزے گنے تو دو کم تھے۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح دو چوزے گم ہوئے تھے جین لباڈی نے دل میں کہا، "اگر چیل میرے چوزے نہیں لے جاتی تو پھر یہ کام یقیناً میرے پڑوسی آندری کا ہے۔"

جین لباڈی نے جی میں ٹھان لی کہ وہ ضرور چور کو پکڑے گا۔ اور اسی رات سے بندوق ساتھ لیکر مکان کے پچھواڑے سونے لگا۔ جہاں مرغیوں کا دڑبا تھا۔ دو دن تک اس نے اسی طرح نگرانی کی مگر نہ چوزے گم ہوئے اور نہ کوئی چور پکڑا گیا۔ جین نے سوچا کہ ضرور آندری کو پتا چل گیا ہے کہ میں پچھواڑے سوتا ہوں۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ آندری سے پوچھنا تو بری بات ہے۔ بھلا کوئی کسی سے کیسے پوچھے کہ "تم نے میری مرغیاں تو نہیں چرائیں؟" اس نے

جین بھی خاموش ہو رہا۔

ایک دن آندری نے جین سے کہا: "میں اپنے چمن کی باڑھ ٹھیک کر رہا ہوں۔ تم بھی میری مدد کرو۔" جین اُس کے ساتھ کام کرنے لگا۔ کام کرتے کرتے اس کی نظر چمن کے۔ ایک کونے پر پڑی۔ وہاں مرغیوں کے پروں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگا تھا۔ جین نے غور سے دیکھا یہ بالکل انہی چوزوں کے تھے جو گُم ہو گئے تھے۔ مگر یہ بات وہ آندری سے کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ چپ چاپ باڑھ کاٹنے اور سوچنے لگا۔ کہ آخر کون سی ترکیب کی جائے۔ کہ آندری کو چوزے چرانے کی پھر ہمت نہ پڑے۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ" اگر آندری کو یہ بتا دیا جائے کہ میرے پاس ایک کتا بھی ہے تو پھر وہ میرے پچھواڑے آنے کی ہمت نہ کرے گا۔" یہ سوچ کر اس نے آندری سے کہا، "آندری تم نے میرا سیاہ کتا دیکھا ہے؟"

"کتا؟" آندری نے تعجب سے کہا۔ "تمہارے پاس تو کوئی کتا نہیں تھا۔"

"مگر اب ہے" جین نے کہا "بات یہ ہے کہ کوئی چور رات کے وقت پچھواڑے سے میرے چوزے چرا کر لے جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے ایک ریڈ انڈین سے یہ کتا خریدا ہے بہت بڑا اور خطرناک کتا ہے۔ اب کوئی چور بچ کر نہ جا سکے گا۔"

"اچھا تو اب تم نے ایک کتا خرید لیا ہے؟" آندری نے کہا۔

جین نے کہا "وہ دیکھو، وہ رہا میرا کتا، کیسا کالا ہے، بالکل کوئلے کی طرح۔ وہ دیکھو اس کی لال لال زبان لٹک رہی ہے۔ کتنے بڑے پنجے ہیں اُس کے۔"

آندری نے کہا، "مجھے تو کوئی کتا نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"تمہیں نظر نہیں آتا؟" جین نے کہا "ارے بھئی وہ دیکھو باڑھ کے اُس پار۔"

"کدھر؟" آندری نے پوچھا۔

"ارے بھئی وہ سامنے کی طرف۔ ذرا دیکھو تو اُدھر" جین بولا۔

"ہاں! ہاں! نظر آ گیا" آندری نے کہا "بڑا خطرناک لگتا ہے دیکھنے ہی میں تو۔"

جین خاموش رہا۔ وہ دل ہی دل میں بڑا خوش تھا کہ آندری اتنی آسانی سے اس کے جھوٹ کو مان گیا اور اس کے بعد اُس کے چوزے بھی کبھی گُم نہ ہوئے۔ جین اپنی اس ترکیب پر بہت خوش تھا۔

ایک دن آندری اسے مِلا اور کہنے لگا۔ آج میں نے تمہارے کُتّے کو دیکھا۔ باڑھ کے اُس پار سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ لمبی لمبی لال لال زبان نکالے ہوئے۔ دوڑ کر اس کے راستے سے ہٹ گیا۔"

جین یہ سن کر دل ہی دل میں ہنسا اور کہنے لگا: "لو اور سُنو، میرا کُتّا اگر اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا ہے تو مرغیوں کی حفاظت کون کر رہا ہے؟"

پھر ایک دن آندری نے جین سے کہا: "آج میں نے تمہارے کُتّے کو گاؤں کے اس پار دیکھا۔ خرگوشوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔"

جین نے کہا "بھئی وہ کوئی اور کتّا ہوگا۔ میرا کتّا تو چھوڑے مرغیوں کی نگرانی کر رہا ہے۔"

آندری بولا "تمہارا نہیں تو پھر کس کا تھا؛ تمہارے کُتّے کی زبان لمبی اور لال لال نہیں ہے؟ اس کے بڑے بڑے پنجے نہیں ہیں؟"

"ہیں تو سہی مگر میں نے ابھی بتایا نا کہ میرا کُتّا تو اس وقت بھی گھر کے پچھواڑے موجود ہے۔" جین نے کہا۔

آندری بولا "بہر حال تم اپنے کُتّے کو باندھ کر رکھا کرو۔ گاؤں کے لوگ شکایت کر رہے تھے کہ جین نے اتنا خطرناک کُتّا کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

جین کو بڑا غصّہ آیا کہ آخر گاؤں والوں کو کُتّے کی بات کیسے معلوم ہو گئی مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جب کسی پاس کُتّا ہو تو دوسروں کو پتا لگنا ہی چاہیے۔

چند دن بعد آندری اسے راستے میں ملا۔ اور غصے سے کہنے لگا۔ جین تمہیں اپنے کتے کا کوئی انتظام کرنا ہی ہوگا۔ آج اس نے میری ٹانگ پکڑ لی ہوتی میں نے چھڑی مار کر بھگایا۔"

جین بڑا سٹپٹایا کہ کیا جواب دے۔ کیونکہ یہ کتا تو اب خود اسی کے لیے مصیبت بن گیا تھا آخر اس نے آندری سے کہا۔" اچھا بھائی میں اسے باندھ رکھوں گا۔" اور یہ کہہ کر سیٹی بجانے لگا گویا کتے کو بلا رہا ہو۔ آندری گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور جلدی جلدی وہاں سے چلا گیا۔

چند دن تک کتے کا کوئی ذکر نہ آیا۔ پھر ایک دن جین ایک دوکان میں کچھ چیزیں خریدنے گیا تو وہاں میڈم ولینو مل گئی۔ میڈم ولینو اسے دیکھتے ہی غصے سے کہنے لگی:" جین تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایسے خطرناک کتوں کو یوں کھلا چھوڑ دیتے ہو۔"

جین نے کہا" میڈم میرا کتا خطرناک ضرور ہے مگر میں نے تو اسے گھر میں باندھ رکھا ہے۔"

" کہاں باندھ رکھا ہے!" میڈم نے کہا،" وہ تو سارے گاؤں میں گھومتا پھر رہا ہے۔ لمبی لمبی لال لال زبان نکالے۔ ابھی ابھی تو مجھے دانت دکھانے لگا تھا۔"

جین یہ سن کر بہت گھبرایا اور سوچنے لگا کہ اب اس کھیل کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اور میڈم ولینو سے کہنے لگا۔" میڈم کل صبح میں اس کتے کو واپس کر آؤں گا۔ اسی ریڈ انڈین کو دے آؤں گا جس سے خریدا تھا۔"

میڈم نے کہا:" ہاں! ہاں! یہی بہتر ہے۔"

دوسرے دن صبح صبح جین نے اپنی گھوڑا گاڑی تیار کی اور آندری کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ اسے دور سے آتا دکھائی دیا تو سیٹی بجائی اور ایسی حرکتیں کرنے لگا گویا کتے کو گاڑی میں سوار کرا رہا ہو۔ پھر جب گاڑی آندری کے پاس سے گزری تو آندری نے پوچھا:" کیا کتا واپس کرنے جا رہے ہو؟"

جین نے جواب دیا۔" ہاں، اسی ریڈ انڈین کو واپس کر دوں گا۔"

دوپہر تک جین ریڈ انڈین لوگوں کی بستی میں رہا اور پھر وہاں سے واپس لوٹا تو دیکھا کہ آندری گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جین نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

آندری بولا "بات بُری ہے۔ تمہارا کتّا تم سے پہلے واپس آ گیا۔ میں دُودھ دوہنے کے لئے گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تمہارا کتّا لمبی لال زبان نکالے دوڑا چلا آ رہا ہے۔"

یہ سُن کر جین کو بڑا غصہ آیا اور اس نے آندری سے کہا "تم جھوٹے ہو۔ میں ابھی اسے ریڈ انڈین کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔"

آندری بولا "تو اب تم اپنے پڑوسیوں کو جھوٹا بھی بنانے لگے۔" اور یہ کہہ کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

جین نے سوچا کہ "لو ساری محنت اکارت گئی۔ آج آندری کو جھوٹا کہنے کی بجائے اُسی دن اُسے مرغیاں چرانے پر ڈانٹ دیتا۔ تو نہ کتّے کی جھوٹی بات گھڑنا پڑتی اور نہ اتنی پریشانی ہوتی۔"

اب تو آندری اور میڈم ولینو کے علاوہ اور بھی کئی آدمیوں نے کتّے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ کوئی کہیں دیکھتا تھا کوئی کہیں اور بیچارہ جین پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔

ایک دن جین، لوہار کی دکان پر بیٹھا تھا کہ آندری گھوڑا دوڑاتا وہاں آ پہنچا اور پوچھنے لگا "ڈاکٹر کہاں ہے۔ کوئی ڈاکٹر کو بلا لائے۔"

سب نے پوچھا "کیا ہوا۔ کیا ہوا، خیر تو ہے؟"

آندری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔ جس میں سے خون ٹپک رہا تھا اور جین کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کے کتّے نے کاٹ لیا ہے۔"

جین کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ جھوٹ موٹ کا کتّا نظر آ جانا کوئی بات نہیں۔ اُس کا کاٹ کھانا بھلا کسی کی سمجھ میں آ جائے گا۔ مگر بیچارہ خاموش

رہا اور آندری کے قریب جا کر اس کا ہاتھ غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا: "یہ تو کتے کے کاٹے کا زخم نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کلہاڑے کا زخم ہے۔"

یہ سن کر سب لوگ اُلٹے اسی پر بگڑنے لگے کہ واہ یہ بھی اچھی بات ہے ایک تو کتے کو یوں کھلا چھوڑ رکھا ہے اور جب وہ کسی کو کاٹ کھائے تو کہتے ہو کلہاڑے کا زخم ہے۔

بیچارہ جین بڑا پریشان ہوگیا۔ آخر لوگوں سے کہنے لگا: "بھائیو! میں اس قصّے کو ختم کرتا ہوں۔ دو چُوزے جرمانے کے طور پر آندری کو دیتا ہوں اور تمہارے سامنے کتے کو مار دیتا ہوں۔"

لوگ یہ سن کر خاموش ہوئے تو جین نے کہا: "چلو میرے ساتھ!" سارے لوگ جین کے گھر پہنچے۔ اس نے سب کو پچھواڑے کے میدان میں کھڑا کر دیا اور خود گھر میں جا کر بندوق اٹھا لایا۔ باہر آکر اس نے زور سے سیٹی بجائی اور کہا: "دیکھو وہ آرہا ہے۔"

میڈم دلیتو نے کہا: "ہاں وہ لال لال زبان نکالے آرہا ہے۔"

آندری بولا: "ہاں! وہ بڑے بڑے پنجے اٹھائے آرہا ہے۔"

جین نے بندوق اٹھائی۔ نشانہ باندھا اور بندوق چلا دی اور پھر بولا: "لو وہ مر گیا۔ میرا بڑا اکلا کتا مر گیا۔"

سب بولے "ہاں مر گیا۔" اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آندری بھی بغل میں دو موٹے موٹے چُوزے دبائے چلا گیا اور بیچارہ جین لباڈی اپنے جھوٹ موٹ کے کتے کی قبر کھودنے لگا۔

---

(۶۰)

راپانوئی کے جادوگر

[جنوبی امریکہ کے جنوب مغربی گوشے میں ایک ملک ہے چلی - یہ ملک بڑی دُور تک بحرالکاہل کے کنارے کنارے پھیلا ہوا ہے۔ چلی سے نزدیک ہی بحرالکاہل میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا نام ہے "پولینیشیا" کہتے ہیں کہ اس جزیرے میں کہیں کہیں لکڑی کی بنی ہوئی عجیب عجیب قسم کی مورتیاں نظر آتی ہیں - یہ مورتیاں بہت پرانے زمانے کی ہیں ان کے متعلق پولینیشیا کے لوگوں میں عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں - یہ کہانی بھی انہی میں سے ہے -]

جنوبی امریکہ کے ملک چلی کے پاس ایک جزیرہ ہے جسے ایسٹر آئی لینڈ کہتے ہیں - پہلے زمانے میں اس جزیرے کا نام "راپانوئی" تھا - راپانوی کا ایک بادشاہ تھا - اس کا نام تھا "آری کی ٹی" آری کی بڑا نیک دل بادشاہ تھا - وہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رکھتا تھا - یہی وجہ تھی کہ راپانوی کے لوگ بہت خوش خوش رہتے تھے - مگر ایک بات انہیں پریشان رکھتی تھی - راپانوی میں چند جادوگر بھی تھے جو لوگوں پہ جادو کرتے رہتے تھے - یہ جادوگر جب چاہتے اپنی شکل بدل لیتے - اسی لئے لوگوں کو پتہ نہ چل سکتا تھا کہ ان میں سے کون جادوگر ہے بس ہر شخص ایک دوسرے سے ڈرتا رہتا اور کوئی نیا آدمی گاؤں میں آجاتا تو لوگ ایک دوسرے

سے کہنے لگتے "کہیں یہی تو جادوگر نہیں ہے" کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گاؤں ہی کا کوئی آدمی کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتا تو لوگ اسی سے ڈرنے لگتے اور اسی کو جادوگر سمجھ لیتے۔ مگر اصلی جادوگروں کا کسی کو پتا نہ چلتا۔

ٹاپانوری کا بادشاہ آری کی بھی ہمیشہ جادوگروں کا پتہ چلانے کی فکر میں رہتا۔ ایک رات اس فکر میں اسے نیند بھی نہ آئی اور وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی ٹہلنے کے لئے سمندر کے کنارے جا نکلا سورج ابھی نہ نکلا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے آری کی نے دیکھا۔ کہ سمندر کے قریب دو آدمی سو رہے ہیں۔ نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ گاؤں ہی کے دو آدمی ہیں۔ ہیتی رو اور نوکو آری کی بڑا حیران ہوا کہ یہ لوگ یہاں کیوں سو رہے ہیں سوچا کہ انہیں جگا کر پوچھنا چاہیئے کہ یہاں کیوں سوتے ہو۔ مگر ذرا اور نزدیک پہنچا تو انہیں دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگا کیونکہ ہیتی رو اور نوکو کے چہرے تو بالکل ویسے ہی تھے مگر ان کے بدن بالکل مردے کے ڈھانچے کی طرح تھے۔ ساری ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ کھال اور گوشت کا کہیں نام نہ تھا آری کی فوراً سمجھ گیا کہ یہ دونوں جادوگر ہیں اور وہاں سے چپ چاپ واپس آنے لگا ہیتی رو اور نوکو اس کی پیروں کی آہٹ سے جاگ پڑے اور اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے آری کی کو دیکھا تو اٹھ کر اس کے پیچھے جانے لگے۔ آری کی نے نیچی نظروں سے دیکھا کہ جاگتے ہی دونوں کے جسم اصلی حالت پر آ گئے تھے وہ تھوڑی ہی دور بڑھا تھا کہ ہیتی رو اور نوکو اس کے پاس آ گئے اور بولے "حضور صبح صبح ادھر کیسے آ گئے!"

آری کی نے جواب دیا "رات نیند نہیں آئی۔ اس لئے ٹہلنے نکل آیا تھا"

ہیتی رو نے پوچھا "کوئی خاص چیز تو نہیں دیکھی حضور نے؟"

آری کی نے کہا "نہیں تو خاص چیز کیا ہوتی۔ وہی سمندر اور سمندر کا کنارہ ہے جو روز دیکھتا ہوں"

ہیتی رو اور نوکو خاموش ہو گئے اور آری کی یہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں والوں کو ان

دونوں کا بھید کیسے بتاتے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی زبان سے کچھ کہتا تو دونوں اسی پر جادو کر کے اسے مار ڈالتے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچا اور سارا دن ان جادوگروں کا بھید کھولنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اُس رات بھی وہ اُسی فکر میں جاگتا رہا۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔

دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی وہ جنگل میں پہنچا اور املی کا درخت ڈھونڈنے لگا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک درخت ملا۔ آری کی نے اُسے کاٹ ڈالا اور اس کی لکڑی لے کر گھر پہنچا۔ سات دن تک وہ اپنے گھر میں بیٹھا ٹھک ٹھک کرتا رہا۔ لوگ حیران تھے کہ بادشاہ گھر میں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ مگر کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔

ساتویں دن آری کی نے لکڑی کی دو مورتیاں تیار کر لیں۔ ایک مورتی میں ہینی رو اور نوکو بالکل اسی شکل میں تھے جیسے کہ آری کی نے انہیں سمندر کے کنارے دیکھا تھا یعنی چہرے تو صحیح سالم مگر باقی سارا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ اور دوسری مورتی میں ہینی رو اور نوکو عام آدمیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ مورتیاں آری کی نے اتنے کمال کی بنائی تھیں کہ بچّہ بھی دیکھے تو پہچان لے کہ ہینی رو اور نوکو ہیں۔

یہ دونوں مورتیاں آری کی نے گاؤں کے بیچوں بیچ ایک میدان میں رکھ دیں۔ جہاں گاؤں کے سارے لوگ انہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح بغیر کچھ کہے سُنے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ ہینی رو اور نوکو جادوگر ہیں اور سب لوگ ان سے الگ رہنے لگے۔ ہینی رو اور نوکو بھی اب کسی پر جادو کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے اور چند دن بعد وہ دونوں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ایک ناؤ میں بیٹھ گئے اور کہیں دُور چلے گئے۔ آخر اس طرح راپانوی کے لوگوں کو جادوگروں سے چھٹکارا مل گیا۔

ایسٹر آئی لینڈ میں آج بھی وہ مورتیاں نظر آتی ہیں جو آری کی نے بنائی تھیں۔

(ختم شد)

اچھی اچھی کتابیں

بچوں کو آداب سکھایئے (باتصویر)

تصنیف:۔ رہوڈا۔ ڈبلیو۔ بیکمیسٹر ——— ترجمہ:۔ مولانا عبدالمجید سالک

بچے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ والدین واساتذہ ہونے کی حیثیت سے بچوں کی رہنمائی وتربیت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ نشوونما کی ہر منزل میں بچے کو ہماری مدد کی ضرورت ہوتی ہے آپ جو کچھ اسے بچپن میں سکھاتے ہیں۔ وہ اس کی آئندہ زندگی میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اس کتاب میں بچے کی ابتدائی تربیت کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۲/۵۰

دُوسروں سے نباہ (باتصویر)

تصنیف:۔ ہیلن شیکٹر ——— ترجمہ:۔ اشفاق احمد

کیا آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کو پسند کریں اور ان کا برتاؤ آپ کے ساتھ بہتر ہو؟ یقیناً آپ کا جواب اثبات میں ہوگا۔ بچے کے ناپختہ ذہن کی نشوونما میں ماحول کا بڑا حصہ ہے اس کتاب میں بچے کے روزانہ معمولات، طرزِ گفتگو اور بہن بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۲/۵۰

تمہارے مسئلے کیوں کر حل ہوں؟ (باتصویر)

تصنیف:۔ رابرٹ یا ایچ بی شور ——— ترجمہ:۔ مولانا عبدالمجید سالک

زندگی نام ہی مسئلوں کا ہے۔ اگر تم ان سے نہ گھبراؤ اور ان کو حل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہو تو زندگی میں خاص دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو مسئلوں کو حل کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ یہ طریقہ کیوں کر سیکھا جائے؟ قیمت:۔ ۲/۵۰

تمہاری تندرستی (باتصویر)

تصنیف:- جے روز ویل گیلاگر ـــــ ترجمہ:- مولانا عبدالمجید سالک

تندرستی ہزار نعمت ہے۔ تندرست آدمی کو ہر چیز میں مزہ آتا ہے۔ کام میں، اسکول میں، کھیل میں خوب جی لگتا ہے۔ ہر شخص اپنی صحت کو بہتر بنانے کا خواہشمند ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اس کتاب میں ضروری معلومات حاصل کیجئے اپنے جسم کے متعلق، خوراک کے متعلق، بیماریوں اور ان کے علاج کے متعلق۔ قیمت:- ۲/۵۰

پاکستان، معاشرہ اور ثقافت

تصنیف:- سٹینلے میرن ـــــ ترجمہ:- مولانا غلام رسول مہر

اس کتاب میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں شہری اور دیہاتی زندگی، پاکستان کا معاشرتی اور ثقافتی دور، ایشیا اور دنیا میں پاکستان کے مقام کے متعلق فاضل مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیمت: ۷/۵۰

قیامت کی رات

تصنیف:- والٹر لارڈ ـــــ ترجمہ:- سید عابد علی عابد

۱۰ اپریل ۱۹۱۲ء کو بحری جہاز "ٹائی ٹینک" اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا تو بنانے والوں نے دعویٰ کیا کہ تقدیر بھی اس جہاز کو غرق نہ کر سکے گی ـــــ لیکن ہوا کیا؟ پہلے ہی سفر میں برف کا ایک کوہ پیکر تودہ اس سے ٹکرایا تو جہاز کے ساتھ پندرہ سو افراد بھی سمندر کی نذر ہو گئے۔ اس جہاز کی زندگی کی آخری رات کی داستان۔ قیمت: ۸ روپے

گوشۂ ادب، چوک انارکلی، لاہور

(اشرف پریس لاہور میں باہتمام شیخ محمد اشرف پرنٹر چھپوا کر شائع کیا)